کشمیر میں اُردو شاعری
۱۹۴۷ء کے بعد
محمد یوسف خان عادل

# کشمیر میں اردو شاعری

## ۱۹۴۷ء کے بعد

مقالہ برائے پری پی، ایچ، ڈی

بنگرانی

ڈاکٹر اے، قدوس جاوید

لیکچرار شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی

مقالہ نگار

محمد یوسف خان عادل

شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی

حضرت بل سرینگر کشمیر۔

# کشمیر میں اردو شاعری

۱۹۴۷ء کے بعد

# کشمیر میں اُردو شاعری

## ۱۹۴۷ء کے بعد

(تحقیقی مقالہ)

محمد یوسف خاں عادل

تقسیم کار:

۱۔ آل انڈیا ہندی اردو سنگم۔ لکھنؤ (یو۔پی)

۲۔ آل انڈیا ہندی اردو سنگم (شاخ) جموں و کشمیر۔ سری نگر

۳۔ شمیم گل پبلی کیشنز۔ سری نگر ۱۹۰۰۰۲ (کشمیر)

مصنف : محمد یوسف خاں عادل

اشاعت: بار اوّل ۱۹۸۸ء

تعداد: ایک ہزار

سرورق: سیّد احمد

کتابت: امان مرزا (امروہوی)

قیمت : ۶۰ ساٹھ روپے

طابع : جے۔ آر آفسیٹ پرنٹرس۔ سوئیوالان۔ نئی دہلی ۲

ہماری ریاست کے جانے پہچانے ادیب محمد یوسف عادل نے "کشمیر میں اردو شاعری سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد" پر جو تحقیقی کام کیا ہے اس کی مقامی ادبی حلقوں میں اشد ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی اس سلسلے میں ابتدائی کوششیں ہوئی ہیں، لیکن ایک مقامی ادیب کی جہاں تک میری اطلاع ہے، یہ پہلی کوشش ہے اور بڑی کامیاب کوشش۔

کشمیر کے کئی اردو شعراء کے بارے میں فاضل مصنّف نے جو کاوشیں اور مساعی کی ہیں، وہ نہ فقط قابلِ توجہ ہیں، بلکہ موجودہ کشمیری محققین کے لئے بڑی حد تک راہ نما بھی ثابت ہوں گی۔ !

میں فاضل مصنّف کے حق میں آئندہ کی ادبی کامرانیوں کا خواہاں اور دُعاگو ہوں۔

• پروفیسر شمس الدین احمد
وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی

# تعارف

یوسف عادل گذشتہ چند برسوں سے ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے شعبۂ اُردو سے وابستہ ہیں۔ وہ بہت محنت اور لگن سے اپنے تحقیقی کام میں مصروف ہیں۔ یوسف عادل کو میں اس سے قبل سے ایک محنتی اور شائستہ انسان اور ادب دوست صحافی کی حیثیت سے جانتا ہوں، وہ ایک معلّم کے فرائضِ منصبی انجام دینے کے ساتھ ساتھ پرورشِ لوح و قلم بھی کرتے رہے ہیں۔ شعبے سے وابستگی کے دوران وہ بارہا مجھ سے ملتے رہے ہیں اور عصری اردو شاعری کے بعض دشوار اور تشریح طلب نکات پر گفتگو کرتے رہے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ معاصر اردو شاعری کے مسائل و موضوعات سے ناآشنا نہیں ہیں۔ وہ معاصر اردو شاعری کے منظر نامے سے بھی گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی مناسبتِ طبع کے مطابق پری پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے "کشمیر میں، اردو شاعری" کے موضوع پر کام کیا ہے۔ اور اب وہ جرأت رندانہ سے کام لے کر اُسے کتابی صورت میں چھپوا رہے ہیں۔ میں ان کو دلی مبارکباد دیتا ہوں۔

عصری شعراء پر قلم اُٹھانا، خاص کر جب وہ بقیدِ حیات ہوں، بھڑوں کے چھتّے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔ یوسف عادل کو خود بھی احساس ہے کہ یہ کام خاصا صبر طلب، جُھم جو یانہ اور کٹھن ہے۔ لیکن وہ اس مرحلے سے بخیر و خوبی گذرے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شعراء کے تئیں اُن کا رویّہ

مجموعی طور پر تنقیدی کم اور تحسینی زیادہ رہا ہے۔ اُن کی سلامت روی بھی اُن کے تحفظ کا سامان فراہم کرتی ہے۔ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ ریاست کے کئی نسلوں کے شعراء کے حالاتِ زندگی کے بارے میں انھوں نے ضروری مواد جمع کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شعری خدمات کا بھی ایک تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کا یہ تحقیقی اور تنقیدی کام مکمل اور جامع نہیں کہلایا جا سکتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ معاصر شعراء پر، جب کہ ان کا تخلیقی سفر ابھی نا تمام ہو اور جب کہ ان کی ساری تخلیقات منظر عام پر نہ آئی ہوں، کوئی حتمی اور مکمل کام نہیں ہو سکتا۔ تاہم یہ کیا کم ہے کہ یوسف عادل کا یہ کام حرفِ آغاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یوں اِس کی افادیت مسلّم ہو جاتی ہے۔

مجھے امید ہے کہ یوسف عادل کی یہ کتاب ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔!

● ڈاکٹر حامدی کاشمیری
پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی۔

لائقِ صد ستائش ہے "آل انڈیا اردو ہندی سنگم" جو محمد یوسف عادل کی کتاب "کشمیر میں اردو شاعری" کو شائع کر رہا ہے۔ عادل صاحب ایک قابل معلم، محنتی محقق ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین ادیب بھی ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ عادل صاحب جیسے فہیم میری سرپرستی میں معلم کے فرائضِ منصبی انجام دے رہے ہیں اور پرورشِ لوح و قلم بھی کر رہے ہیں۔ میری تمنا ہے کہ زیرِ نظر کتاب ذہن کے بند دریچوں کو وا کرنے کا وسیلہ ہو۔ مجھے یقینِ کامل ہے کہ وطن دوست قارئین، اور ادب دوست طالب علم اسے بہت حد تک پسند کریں گے اور استفادہ کریں گے۔ عادل صاحب اور اردو ہندی سنگم دونوں اس مستحسن کام کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

● محمد اقبال کھانڈے
(آئی۔ اے۔ ایس)
ناظمِ تعلیمات کشمیر

کشمیر کا ادبی و تہذیبی سرمایہ اتنا وقیع اور قابلِ قدر ہے کہ ادب و تہذیب کے پوشیدہ خزانوں کے متلاشی محققین اور عصرِ حاضر میں زندگی اور ادب میں صالح اور تعمیری قدروں کے حامی دانشوروں کو یہاں روشنی کا ایک سیلاب نظر آتا ہے ۔ لیکن بدقسمتی سے اردو زبان کے نقّادوں اور محققین نے اس جانب کم سے کم توجّہ کی ہے ۔ اس پس منظر میں وادئ کشمیر میں شعری وادبی روایت سے متعلق کوئی کوشش سامنے آتی ہے تو امیدوں کے اَن گنت چراغ جل اٹھتے ہیں ۔ نوجوان ادیب و شاعر یوسف عاؔدل نے کشمیر میں اردو شاعری کے موضوع پر میری ہی نگرانی میں اپنا تحقیقی مقالہ سپردِ قلم کیا تھا اور ایسی ہزار ہا پریشانیوں اور مسائل کے باوجود موضوع کے ساتھ انصاف کرنے کی پوری کوشش کی تھی ۔ اب یہ مقالہ کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے اور مجھے یقین ہے کہ کشمیر میں اردو شعر و ادب کے طالب علموں کو اس سے خاطر خواہ فائدہ پہنچے گا اور باذوق حضرات بھی کشمیر میں اردو شاعری کی ابتدا و ارتقاء، روایات و رجحانات سے متعلق معلومات حاصل کر سکیں گے ۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ یوسف عاؔدل کی یہ تصنیف ہند و پاک کے ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی ۔

● ڈاکٹر قدوس جاوید
ریڈر شعبۂ اردو
کشمیر یونیورسٹی

"محمد یوسف عادل ایک باصلاحیت ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ تحقیق سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اُن سے اُردو ادب کو بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ زیرِ نظر کتاب اُن ادب نواز حضرات کے لئے دلچسپی کا باعث ثابت ہوگی، جو معاصر شعری ادب کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ اپنے لئے ناگزیر گردانتے ہیں۔

چونکہ اس سے پہلے کشمیر میں اُردو اور بالخصوص کشمیر میں معاصر اُردو شاعری کے موضوع پر مواد نہ ہونے کے برابر تھا ـــــ اس لئے عادل صاحب کا یہ کام قابلِ ستائش ہے۔"

رخسانہ جبین
پروڈیوسر ریڈیو کشمیر
سری نگر
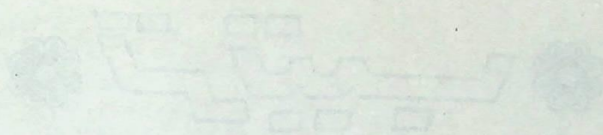
# حرفِ اوّل

"کشمیر میں اردو شاعری ۴۷ء کے بعد" حاضرِ خدمت ہے۔

شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی کے تحت یہ مقالہ میں نے پری پی۔ایچ۔ڈی ڈگری کے لئے ترتیب دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس موضوع سے متعلق چند مضامین اور جستہ جستہ نوٹس بعض رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ لیکن کشمیر میں اردو شاعری کا بالتفصیل جائزہ ابھی تک نہیں لیا گیا ہے۔ پاکستان میں جناب حبیب کیفوی نے اپنی کتاب "کشمیر میں اردو" میں کشمیر کے اردو شعراء کا ذکر کیا ہے، اسی طرح پروفیسر عبدالقادر سروری نے بھی اپنی کتاب "کشمیر میں اردو" میں کشمیر کے اردو شعراء کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اول تو یہ سبھی مطالعے بالعموم آزادی سے قبل یا اس کے آس پاس کے اردو شعراء تک ہی محدود ہیں، دوم آزادی کے بعد شعر و ادب میں پیدا ہونے والے اہم رجحانات کے حوالے سے کشمیر میں اردو شاعری کا جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ اور نہ ہی کشمیر میں اردو شاعری کی ابتداء و ارتقاء کا تاریخی جائزہ ہی پیش کیا گیا ہے۔ میں نے اپنے مقالے میں یوں تو بالخصوص آزادی کے بعد کشمیر میں ہونے والی شاعری کا جائزہ پیش کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی کشمیر میں اردو شاعری کی ابتدا و ارتقاء سے بھی تاریخی حوالوں کی مدد سے بحث کی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ چندر بھان، میر کمال الدین اندرابی رسوا، میرزا عبدالغنی بیگ قبول اور پنڈت دیارام کاچرو خوشدل کشمیر کے اولین شعراء ہیں۔

مقالے کے دوسرے باب میں کشمیر کی تاریخ آزادی، کشمیر کی روایتی فرقہ

وارانہ ہم آہنگی، نیشنل کلچرل فرنٹ کا قیام اور ترقی پسند تحریک کی شروعات وغیرہ کے پس منظر میں خاص طور پر مہجور، نادم، ساگر، پردیسی، نازکی وغیرہ کے حوالے سے کشمیر میں اردو شاعری کی ابتدا اور اُس کی خصوصیات کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

تیسرے باب میں کشمیر میں اردو شاعری پر جدیدیت کے رجحان کے اثرات کے پس منظر میں کشمیر کی جدید علامتی اور استعاراتی انداز کی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جدیدیت کے شور شرابے میں پرانی لیکن مستحکم شعری روایات کی کس طرح کشمیر کے اردو شعرا نے پاس داری کی ہے۔! اس ضمن میں ناصر کاظمی، ساقی فاروقی، سلیم احمد، شمس الرحمن فاروقی کی شعری روایات اور تجربات کے پس منظر میں کشمیر کے اردو شعراء، خصوصاً حامدی کاشمیری، حکیم منظور، ایرج وغیرہ شعراء کی شعری اہمیت سے بحث کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں مقالے کے چوتھے باب میں ترقی پسند تحریک کے عروج و زوال، نئی اصناف کی تشکیل، مختلف ملکی وغیر ملکی زبانوں کی شعری روایات و تجربات سے بحث کی گئی ہے اور اس تناظر میں کشمیر پر فارسی کے غلبہ نیز تاریخی اسباب کی بناء پر اردو کا عروج، اردو اخبارات کا اجراء وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مختلف مشاعروں اور مذاکروں میں مولانا شبلی، فیض، جگر مرادآبادی، جوش اور فراق جیسے شاعروں اور دانشوروں کی بار بار کشمیر آمد کا، کشمیری میں اردو شاعری کے فروغ پر کیا اثر پڑا۔؟ اس ضمن میں کشمیر میں اردو میں تنقیدی اور تحقیقی کام کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور خاص طور پر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی کے حوالے سے پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر شکیل الرحمن اور پروفیسر حامدی کاشمیری وغیرہ کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جموں و کشمیر میں اردو کا سرکاری زبان ہونا اور ریڈیو، الفاظ، ٹیلی ویژن، تھیٹر اور

ٹی۔وی وغیرہ کے اثرات کا بھی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔
آخر میں خاص طور پر آزادی کے بعد شعروادب میں اپنا مقام بنانے
والے نمائندہ کشمیری شعراء کا خصوصی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی
گئی ہے۔

چونکہ یہ مقالہ ایم فِل کے لئے ترتیب دیا گیا ہے، اس لئے اس میں
اس بات کی گنجائش نہیں تھی کہ تمام مذکورہ شعراء کے کلام کا تفصیلی
جائزہ پیش کیا جاتا۔ اس لئے مقالے میں بعض شعراء کا محض تعارف کراتے
ہوئے نمونۂ کلام درج کیا گیا ہے۔ اس طرح تشنگی کا احساس تو باقی رہتا
ہے لیکن مجھے امید ہے کہ یہی احساسِ تشنگی مجھے آئندہ اس موضوع پر
زیادہ تفصیل سے لکھنے کی تحریک بخشے گا۔

یہ مقالہ ہرچند کہ تحقیق سے زیادہ تنقید کا متقاضی تھا لیکن تحقیق
کے اصولوں کے مطابق میں نے حتی الامکان تمام تر تحقیقی سرچشموں، ماخذات،
حوالہ جات اور تذکروں سے کسبِ فیض کی کوشش کی ہے۔ پھر بھی اگر کوئی
کمی رہ گئی ہو تو اس کے لئے میں اپنی کم علمی کو ہی ذمہ دار ٹھہراؤں گا۔

میں اپنے مشفق نگراں جناب ڈاکٹر اے۔ قدوس جاوید کا شکریہ ادا کرنا
اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں۔ جنھوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی۔

صدرِ شعبۂ اردو ڈاکٹر حامدی کاشمیری کے علاوہ تمام اساتذۂ کرام
کا بھی شکرگزار ہوں، جنھوں نے مجھے اپنی شفقتوں سے نوازا۔

میں اپنی محسنہ فاطمہ معصوم کا خاص طور پر شکریہ ادا کرتا ہوں،
جنھوں نے اپنی گھریلو مصروفیات کے باوجود اپنی بے پناہ حوصلہ
افزائی سے مجھے "بالِ جبریل" عطا کر کے علم کی بے کراں وسعتوں میں
محوِ پرواز کیا۔

اس کے ساتھ ہی میں اپنے پیارے بچوں (قرۃ العین، شمیم اعجاز) کا

شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں، جو اپنی معصوم مسکراہٹوں سے ہمیشہ میرا حوصلہ بڑھاتے رہے۔

• محمد یوسف خاں عادل
ریسرچ اسکالر
سری نگر (کشمیر)

سنہ ۱۹۸۵ء

# باب اوّل

## کشمیر میں اُردو شاعری

## ابتدا و ارتقاء
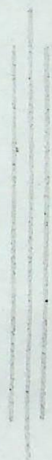
# کشمیر میں
# اُردو شاعری کی ابتدا وارتقاء

زبان وادب کی پیدائش اور ارتقاء کا عمل بے حد پیچیدہ اور پُر اسرار ہوتا ہے۔
زبان کی پیدائش کا عمل نامحسوس طور پر ایک نایافت زمانے سے جاری ہوتا ہے اور
جب اس کی شکل متعین ہو جاتی ہے تو لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ کسی زبان کا وجود
عمل میں آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مختلف بولیوں اور زبانوں کے الفاظ اور محاورے باہم
مِل جُل کر زبان کی ایک نئی صورت کو جنم دیتے ہیں اور وقت و حالات کے سانچے میں
ڈھل کر اس بولی یا زبان کے جو الفاظ کھرے ثابت ہوتے ہیں، وہ اس بولی یا زبان کا
سرمایہ ہوتے ہیں اور جو الفاظ کھوٹے ثابت ہوتے ہیں، فطری طور پر ترک کر دئے جاتے ہیں۔

اُردو زبان کی پیدائش کا عمل بھی دکن اور دہلی کے حوالے سے ان ہی پیچیدہ اور
پُر اسرار مرحلوں سے عبارت ہے۔ اور یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ جس زمانے میں
دکن میں قطب شاہ ولیؔ، حاتمؔ اور آبروؔ وغیرہ شعر کہہ رہے تھے، تقریباً اسی زمانے
میں برصغیر کے دور دراز علاقوں میں بھی اردو شاعری کی چنگاریاں پھوٹتی نظر
آرہی تھیں۔ مثال کے طور پر کشمیر میں قطب شاہ ولیؔ، حاتمؔ اور آبروؔ کے زمانے سے
تقریباً سو سال بعد ہی اردو میں شعر کہے جانے کی مثالیں ملتی ہیں۔

قطب شاہ کا زمانہ (۱۶۵۸-۱۶۲۸ء) شاہجہاں کے دورِ حکومت کا زمانہ ہے۔

ہیں وہ واقعی اس کی اپنی فکر کا نتیجہ ہیں، چندر بھان کو کشمیر کا پہلا اردو شاعر تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کشمیر میں اردو شاعری کی ابتدا کا سہرا کس کے سر باندھا جائے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری اپنی کتاب "کشمیر میں اردو" میں اور دوسرے کئی محققین نے میر کمال الدین حسین اندرابی المتخلص بہ رُسوا کا ذکر کشمیر کے پہلے شاعر کے طور پر کیا ہے۔ چنانچہ سروری صاحب لکھتے ہیں:

"میر کمال الدین حسین اندربی رسوا سے کشمیر میں اردو کے ترقی یافتہ روپ کا آغاز ہوتا ہے۔"

رُسوا اورنگ زیب کے آخری عہد کے کشمیری انشا پردازوں اور شاعروں میں نُمایاں مقام رکھتے ہیں۔ وہ کم و بیش شمالی ہند کے ابتدائی دور کے لکھنے والوں جعفر زٹلی، افضل اور فاضلی کے معاصر تھے۔ انشا میں وہ اپنے عہد سب سے مشہور علما میں سے ہیں، ان کی انہی صلاحیتوں کی وجہ سے اکثر امرا، و نظمائے کشمیر اُن کے قدر دان تھے اور مکتوب نگاری کی خدمت ان کو تفویض کرتے تھے۔ فاضل خاں ناظم کشمیر (۱۷۰۱-۱۶۹۸) نے ان کی سرپرستی کی۔ فاضل خاں کے بعد عنایت اللہ خاں ناظم کشمیر (۱۷۱۳-۱۷۱۲) سے بھی اُن کا توسل رہا۔ چنانچہ سفر حج سے اس کی واپسی کے بعد اُس کی مہار کباد میں ایک نفیس رقعہ لکھا۔ رُسوا دہلی میں رہتے تھے جہاں اُن کے فن کی قدر ہوئی۔ شہزادہ اکبر شاہ کی سرکار میں وہ ملازم رہے۔ لیکن جب معظم نے اکبر شاہ کو شکست دی تو وہ کشمیر لوٹ آئے اور یہاں اپنے فن کی خدمت اور نوجوانوں کو اس فن میں تربیت کرتے ہوئے زندگی گزار دی چنانچہ اس فن میں ان کے تلامذہ ہوئے ایک شاگرد لچھی رام نے ان کے رقعات کو ان کے فارسی اور اردو کلام کے ساتھ ایک مجموعے کی صورت میں اکٹھا کر کے "رقعات حاتم الکمال" کے نام سے موسوم کیا۔ اس کے مخطوطے محکمۂ تحقیقات سری نگر کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

رُسوا کا اردو کلام ریختہ، نظموں اور غزلوں کی شکل میں ملتا ہے۔ اُن کی

یک ریختہ نظم حسبِ ذیل ہے :-

امشب صنم کے واسطے جان وتنم درجنگ ہے
سازِ غیبِ دل ......... آہنگ ہے[1]

از دیدۂ خون ب رمن وزنالہائے زارمن
اندر سرائے تارمن سب جوش ہے سب تنگ ہے

دُوری کرا ز چشم ترم درزِ چشم زادسر
امادل غم پرورم تجھ سنگ دل کے سنگ ہے

باغیرِ اُلفت تاکُجا از یار وحشت تابکی ......!
سب سوں وفا ہم سوں جفا اے بے وفا کیا ڈھنگ ہے

کو باش اصدر عاشقاں مجھ سا بلا گرداں کہاں
ہر چند از عشق چو من تجھ بے وفا کو ننگ ہے

تا رفتہ از دیدہ ام باکس نیا رامیدہ ام
از جملہ جگ رنجیدہ ام باکامیاہم جنگ ہے

رسوانے اردو میں غزل، ریختہ اور نظم میں طبع آزمائی کی۔ ان سارے اصناف میں انھوں نے اپنے ہم عصروں دہلی کے یکرنگ اور ادرنگ آباد کے تاجی سے ملتا جلتا رنگ اپنایا۔ ملاحظہ ہو ان کی ریختہ مناجات :-

شُد نفس وشیطان رہبرم اللہ میاں تیرا کرم
از ہر چہ گوئی بدترم اللہ میاں تیرا کرم

غیر از تو موجود ہے نہیں میرا سکا سب تائیب
خالق نہیں، رازق نہیں اللہ میاں تیرا کرم

در خلوت ودر انجمن، ماں باپ اور فرزند وزن
تُجھ بن نہیں آرام من اللہ میاں تیرا کرم

---

۱۔ سرور ی صاحب نے مصرع اسی طرح نقل کیا ہے۔

ناکردنی کردم بسی ناخوردنی خوردم بسی
با خود گنہ کردم بسی اللہ میاں تیرا کرم

ہستیم ہمچوں خر بگِل از فعل بے ہودہ فعل
مارا بہ نفسِ ماہمل اللہ میاں تیرا کرم

ریختہ غزل ملاحظہ ہو :-

محبت پیت معشوقوں میں کم ہے
نہ از عشاق پروا ہے نہ غم ہے
نہیں یک لحظہ از یادِ تو غافل
تمہارے نہہ میں دل دمبدم ہے
بہت مشتاق ہیں تیرے ولیکن
تمہ کانے سے محب دو لوٹں کم ہے
ارے کوئی جہاں میں یار کم ہے
اگر ہے یار بے آزار کم ہے
ندیدم بے جفا یک بے وفا را
درین گلشن بے خار کم ہے
دلی را دم دغمہارا خریدم
جگت میں پیت سا بیپار کم ہے

:.:

بیک نظارہ دل دادیم از دست      دل و جاں اس لٹک اوپر فدا ہے
وفا دشمن، جفا خو ہے، بلا ہے      ستم گر بے وفا یہ کیا ادا ہے
بمسکین دل بدہ دیدار کی بھیک
گدا ہے، بے نوا ہے، بے خدا ہے

رسوا کے بعد جو شاعر ہمیں کشمیر کے اردو شعرا میں بہت بلند پایہ اور مقتدر

نظر آتے ہیں، میرزا عبدالغنی بیگ قبولؔ۔ یہ کشمیر کے بلند مرتبہ اساتذۂ فارسی میں شمار ہوتے ہیں۔ غنیؔ کاشمیری کے معاصر مرزا داراب جوؔیا کے شاگردوں میں یہ بہت اہم اور بلند قامت کے مالک ہیں۔

پیر حسن کھویہامی اپنی "تاریخِ کشمیر" میں ان کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

"قبولؔ فارسی کے علاوہ اُردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ اُن کا زیادہ کلام نہیں ملتا۔ تذکروں میں اُن کا ایک شعر نقل کیا گیا ہے۔ جو حسبِ ذیل ہے ؎

دل یوں خیالِ یار میں پھرتا ہے نعرہ زن
تاریک شب میں جیسے کوئی پاسباں پھرے" [۱]

یہ صحیح ہے کہ قبولؔ کا زیادہ کلام تلف ہو چکا ہے اور زمانے ان کو مٹا دیا ہے۔ لیکن تواریخی شواہد اُن کو بہت حد تک زندہ رکھیں گے۔ "تاریخِ کشمیر" میں اگرچہ بڑے کرّ و فر سے اُن کا ذکر کیا گیا ہے مگر اس میں ان کی شعری سوغات کو منظرِ عام پر نہیں لایا گیا۔ ہاں کئی تذکروں میں ان کے فارسی اشعار بڑے طنطنے سے نظر آتے ہیں۔ کئی تذکروں میں ان کا نام میرزا علی بیگ اور کئی میں شیفتہ غنی بیگ ظاہر کیا گیا ہے۔ قطب الدین باطنؔ [۲] نے ان کا نام میرزا علی بیگ لکھا ہے، جب کہ پیر غلام حسن ابراہیم خاں خلیلؔ [۳] نے ان کا پورا نام میرزا عبدالغنی بیگ قبولؔ لکھا ہے۔

قبولؔ کی ولادت کا سن اگرچہ تواریخ اور تذکروں میں صاف نظر نہیں آتا۔ مگر ان کا سنِ وفات ۱۷۲۵ء بتایا جاتا ہے۔ قبولؔ نے اپنے پیچھے ایک فرزند المتخلص بہ میرزا گرامی چھوڑا۔ جس کا ذکر میرؔ اور قائمؔ نے طبقۂ دوم کے شعراء میں کیا ہے۔ گرامی کا یہ شعر

---

۱۔ تاریخ کشمیر۔ از پیر حسن ۲۔ تاریخ داں
۳۔ تذکرہ نگار و تاریخ داں

اُن دنوں کافی مشہور تھا ؎

حاضری بن محل نہیں کھاتا :: بیگمی ہے پنیر صنعم کا

تذکرۂ میر میں گرامی کے بارے میں لکھا ہے :-

"چیز ہائے چند از قبیل شعبدہ ہزلات بدست آوردہ عالمی۔ باب میراند وبطور علاحدہ وزنا ...... باکمال بے معنی وبے باکی میزیست، ہموار مطعون زبان ارباب تحقیق حی بود در آخر سلطنت حضرت فردوس آرام گاہ حرف وجودش کزملک فنا از صفحۂ روزگار برداشت "

کشمیر کے اردو شعراء میں جس شاعر کو تیسرا بڑا شاعر تسلیم کیا جا سکتا ہے، وہ ہے پنڈت دیا رام کاچرو خوشدل، فارسی ادب کے یہ جانے پہچانے شاعر ہیں اور انشا پرداز بھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ فنِ خطاطی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے افغان دور میں آنکھ کھولی۔ سن تھا ۱۷۷۲ء، جائے پیدائش رعنا واری سری نگر۔ ان دنوں کشمیر پر افغان ناظم عطا محمد خاں مسندِ اقتدار سنبھالے ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ خوشدل انشا پردازی میں اتنے مقبول ہوئے کہ تیمور شاہ نے اُن کو اپنا میر منشی بنا دیا۔ چنانچہ وہ کابل تک ہو آئے۔

پروفیسر سروری نے انہیں وفادار خاں کا بھی میر منشی قرار دیا ہے۔ خوشدل نے قصیدہ، مثنوی اور غزل میں طبع آزمائی کی ہے۔

انہوں نے مثنوی میں سفرنامۂ کابل رقم کیا ہے۔ اس مثنوی میں شاعر نے سرینگر سے لاہور اور لاہور سے کابل تک کے بڑے بڑے شہروں کو جنت نشان قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو ان کی حُبّ الوطنی ؎

مرا یادِ وطن آشفتہ تر کرد :: نمی دانم چرا قسمت بدر کرد
زجوشِ گریہ چشمم اچھ دل شُد :: بہت شُد مار شُد تالاب ڈل شُد

خوشدل کی دلچسپیاں وسیع موضوعات پر حاوی تھیں۔ شعر و انشا پردازی اور خوشنویسی کے[1]

---

[1] پروفیسر عبدالقادر سروری "کشمیر میں اردو"

علاوہ انہیں موسیقی سے بھی لگاؤ تھا۔ انھوں نے موسیقی پر ایک رسالہ بھی لکھا تھا۔ اُنکی یادگارِ زمانہ ایک بیاض ہے، جو بہت ضخیم ہے اور مثنوی اندرجات پر حاوی ہے، اسمیں انھوں نے اپنی پسند کے منتخب اشعار، اساتذہ کی مثنویاں، تاریخی قطعات سب جمع کئے ہیں۔ موسیقی کے راگوں اور راگنیوں کے سلسلے میں کئی اشعار اور ریختے بھی لکھے ہیں۔ مثلاً "ایک فرد ہندی ہے[۱]:

آگئے تھے مثلِ شبنم، سیرِ گلشن کر چلے

باغباں تو دیکھ لے اپنا چمن، ہم گھر چلے "

دو ابیات یہ ہیں:

| | |
|---|---|
| خود فنا ہو کے ذات سوں ملنا | یہ تماشا حباب میں دیکھا |
| آپ کوں سوز اور کوں لذت | یہ صفت کوں کباب میں دیکھا |

ذیل کا قطعہ بھی بیاض سے ماخوذ ہے۔

| | |
|---|---|
| مدارِ دارِ دُنیا در سفر ہے | یہ آبِ زر لکھا ہے بو علی نے |
| کہ عمرِ بے وفا اندر گذر ہے | کہ سونے سے مسافر کوں خطر ہے |

موسیقی سے لگاؤ کے سبب انھیں اردو شاعری کا ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ کچھ اشعار اور قطعات کے علاوہ انھوں نے کئی گیت بھی لکھے ہیں، ذیل میں ایک گیت درج کیا جاتا ہے:

| | |
|---|---|
| اُٹھو میرے لالہ مدن گوپالہ | آیا تیرا بالہ بلاو نہ کو |
| دودھ مکھن چوپٹ کی | دیو انکی بنسی بجاو نہ کو |
| جاگیو گوپالہ لالہ پنچھی بند بولے | جاگیو پنچھی بولہ لالہ پنچھی ہنسے |

سہ تال کی لے میں یہ شعر لکھے ہیں:

| | |
|---|---|
| جس باغ میں بھلی گئی | اُوس باغ میں جانا پڑا |
| اُس باغ میں پانی نہیں | خونِ جگر کھانا پڑا |

---



[۱] - محمد یوسف ٹینگ نے "شبنم" کی جگہ "صبا" رقم کیا ہے۔

# باب دوم

## کشمیر میں اردو شاعری

## ۱۹۴۷ء کے بعد

# کشمیر میں اُردو شاعری
# آزادی کے بعد

کشمیر آزادی سے پہلے نہایت ابتری اور سیاسی اُتھل پُتھل کا شکار تھا۔ ہر طرف آزادی کے متوالوں کو سامراجی عتاب کا نہ صرف شکار ہونا پڑ رہا تھا، بلکہ کسی بھی خود سری کی سزا موت ہوتی تھی۔ چاہیے یہ خود سری تحریر کی موہوم کوشش ہو یا تقریر کی ایک معمولی حرکت۔ ہر صورت میں ڈوگرہ شاہی یہاں کے آزادی پسند ذہنوں کو پامال کرنے پر تُلی ہوئی تھی۔ اندر ہی اندر آزادی کی آگ سُلگتی رہی اور ایک دن اس نے آناً فاناً سامراجی ایوانوں کو بھسم کر ڈالا، حریت کے جیالے مسرت و آزادی کے جام سے سرشار دندناتے پھرنے لگے۔ ان میں معصوم اَن پڑھ لوگ بھی تھے جو نعروں" زندہ یادوں اور اُچھل کود سے اپنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے اور ان میں وہ تعلیم یافتہ دانشور اور حریت پسند طبقہ بھی تھا، جس نے کشمیری عوام کے ذہنوں میں حریت کی شمع روشن کی تھی، ان دانشوروں نے اپنی خوشی کا اظہار قلم کی سرمستی سے کیا۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیری ادب یا کشمیر میں اُردو ادب، جو اُس وقت تک پابندِ سلاسل تھا، اب غلامی کی زنجیریں کاٹ کر نہایت آب و تاب کے ساتھ اپنی آزادی کا جشن منانے لگا۔

اِن دنوں کشمیر سے باہر ایک ایسی آگ لگی ہوئی تھی، جو بُجھائے نہیں بُجھ رہی تھی۔ یہ آگ فرقہ وارانہ فسادات کی آگ تھی۔ لیکن کشمیر چونکہ شروع سے ہی فرقہ وارانہ میل جول اور آپسی بھائی چارے کا گہوارہ رہا ہے۔ اس لئے فسادات کی یہ آگ بانہال کے پہاڑوں کو عبور نہ کر سکی۔ جہاں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ کے شعلے پورے ہندوستان کی صدیوں پُرانی فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور بھائی چارگی کی روایات کو جلا کر راکھ کر رہے تھے، وہیں یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ کشمیر فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے تعلق سے اِس آندھی میں بھی ایک چراغ کی مانند روشنی بکھیر رہا تھا۔ دوسری بات یہ کہ گرچہ فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بانہال کی پہاڑیوں کو عبور نہ کر سکی تھی اور نہ ہی فسادات کشمیر کے دانش وروں اور عوام کا مسئلہ تھے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کشمیر کے دانش وروں نے فسادات کی آگ کو اپنی تحریروں کے ذریعے محبت اور بھائی چارگی کی بارشوں سے بُجھانے کی جیسی کوششیں کیں، ویسی کوششیں اُن علاقوں کے دانشوروں نے بھی اتنے خلوص سے نہیں کیں جو فسادات کی آگ میں جل رہے تھے۔ مثال کے طور پر مہجورؔ، آزادؔ، پریم ناتھ پردیسی اور رامانند ساگر وغیرہ۔

کشمیر کے دانشوروں نے اپنا زورِ قلم ان فسادات کی بیخ کنی پر صرف کیا اور اللہ کا فضل ہے کہ وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ اور ہماری یہ گُل پوش وادی فرقہ پرستی کی آگ سے نہ صرف محفوظ رہی بلکہ یہاں اتحاد و اتفاق کا ایک ایسا نور پھیلا کہ گاندھی جی کو ہند کی گھنگھور کالی گھٹاؤں میں صرف یہیں روشنی کی کرن نظر آئی۔

کشمیر کے ادیبوں نے ایک طرف تو فسادات کے سیلاب کو روکے رکھا اور دوسری طرف نئے کشمیر کے تانے بانے بننے میں اس طرح مصروف ہو گئے کہ باہر مسموم ہوا یہاں آنے سے کترانے لگی۔ کشمیر جو اہلِ دل

آزادی کی نئی نویلی دلہن سے ملاقات کر ہی رہا تھا کہ اس پر مذہب کے نام پر حملہ ہوا۔ مگر اس نازک موقع پر پھر ایک بار یہاں کے ادیبوں اور شاعروں نے اس حملے کو ناکام بنا دیا اور یہ وادی مذہب کے نام پر بٹنے نہ پائی۔ رفتہ رفتہ حالات "خوش گوار" ہوتے گئے۔ عام لوگوں کے ساتھ ادیبوں اور شاعروں نے بھی "نئے طرز" نئی لہر اور نئے حالات کے تحت چلنا شروع کیا۔ حالات کا تقاضا تھا کہ جو لوگ ڈوگرہ شاہی کی چکی میں پس گئے تھے، اب مساوی انداز میں ترقی کریں، اُن کی سماجی، سیاسی، اقتصادی اور فکری زندگی سُدھر سکے۔ اور انھیں تحریر و تقریر کی مکمل آزادی حاصل ہو۔ چنانچہ اس "ضرورت" کو ہر جگہ ہر آن ہر طرف اور ہر ذہن نے قبول کیا اور اس پر سوچنا شروع کیا۔

ان ہی دنوں وادی سے باہر ترقی پسندی کی ایک لہر چل چکی تھی اور یہ لہر سیاسی نعرے کی طرح ہر سمت پھیل رہی تھی اور اپنی فتحمندی کے جھنڈے گاڑے جا رہی تھی۔ جس طرح ہند کی آزادی کی لہر وادی میں وارد ہوئی تھی، اسی طرح نہایت زور و شور اور طمطراق کے ساتھ یہ تحریک بھی وادی میں داخل ہوئی۔ چوں کہ ان دنوں یہاں کے حالات اس تحریک کے لئے نہایت موافق تھے، اس لئے یہاں کے ادیبوں اور شاعروں نے اس تحریک کو والہانہ طور پر گلے لگایا اور نہ صرف اس کا استقبال کیا بلکہ اس کو گھر گھر پہنچانے کا بیڑہ بھی اُٹھایا۔ نوجوانوں کو اس سلسلے میں جو تہذیبی و ثقافتی اور ادبی موڑ دینے کی کوشش کی گئی اُس نے یہاں ایک "نیا" ہی ماحول پیدا کیا۔ اس سلسلے میں نیشنل کلچرل فرنٹ نے بھی بھرپور رول ادا کیا۔ اس فرنٹ کو بعد میں کلچرل کانگریس کہا جانے لگا۔ اس فرنٹ کی کارکردگی اور ترقی پسند لہر کا تذکرہ پروفیسر سروری اپنی کتاب "کشمیر میں اردو" میں اس طرح کرتے ہیں:

"نوجوان ذہنوں کو اس سلسلے میں جو موڑ دینے کی کوشش کی گئی، اس میں نیشنل کلچرل فرنٹ کا بڑا حصّہ رہا ہے، جسے بعد میں کلچرل کانگریس کا نام دیا گیا اور اس کی حدود کو وسعت دینے کی کوشش کی گئی۔ اس حاوی ادارہ کے ماتحت ہر ثقافتی دلچسپی کا ضامن ایک ذیلی ادارہ تھا جو پروگریسیو (PROGRESSING) ایسوسی ایشن، تھیٹر ایسوسی ایشن اور آرٹسٹس ایسوسی ایشن کے نام سے موسوم تھا۔ اس طرح اس مرکزی ادارے نے ایک نئی تحریک کو اپنے حلقے میں سمیٹ لیا اور ان کو نئی راہیں سمجھا کر اور ایک نیا آدرش دے کر انھیں تعمیری کاموں میں لگا دیا۔ کشمیر سے باہر ہندوستان کی وسعت کے لحاظ سے اس کے گوناگوں مسائل نے اگلے دور کی آزادی کی کشمکش میں شریک نوجوانوں کے لئے ایسا کوئی فورم مہیا نہیں کیا تھا۔ پچھلے عہد کی جدوجہد میں باہر سے جو قوتیں آزادی کی جنگ لڑنے والوں کی امداد کر رہی تھیں، وہ اب تعمیرِ نو میں معاون ہونے لگیں۔"

کشمیر میں جو کشمیری ادیب اور شاعر اس ادارہ کی مختلف اکائیوں سے جڑے رہے اُن میں مہجور، راما نند ساگر، پریم ناتھ پردیسی، عبدالاحد آزاد، نور محمد روشن، دینا ناتھ نادم، علی محمد لون، عبدالرحمٰن راہی، غلام رسول نازکی، وشوا ناتھ درماں، اختر محی الدین، بنسی نردوش، امین کامل، غلام نبی فراق، اُمیش کول، تیج بہادر بھان وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ باہر کے ادیبوں اور فن کاروں میں جن لوگوں کا تعاون اور مشورہ اس تحریک کو حاصل رہا اُن میں صلاح الدین احمد، دیوندر ستیارتھی، خواجہ احمد عباس، بلراج ساہنی، راجندر سنگھ بیدی، ایچ۔ ایس رضا، شیلا بھاٹیہ، پربھاکر، شیودان چوہان، اچلا سچدیو، کرنل شیر سنگھ وغیرہ چند نام ہیں۔ ہری سنگھ کی حکومت سے دست کشی اہلِ کشمیر کے لئے دوسری آزادی کے مترادف تھی، اس مسرت نے گویا گھٹے ہوئے جذبات کے بند کھول دیئے اور وہ اپنے اظہارِ بیان کے لئے اپنی خواہش کے مطابق راستے تلاش کرنے لگے۔

پچھلا دور جور دایتی دور تھا، جس میں شاعری زلف کے پیچ و خم اور حُسن کی

چکا چوند میں اپنی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ لیکن آزادی کے بعد شعر و ادب کی نئی جہتیں سامنے آنے لگیں، ادب زندگی کی گتھیاں سلجھانے لگا اور اب یہ انفرادی، اجتماعی اور سماجی تقاضوں کو سمجھنے لگا اور سلجھانے کی فکر میں محو ہو گیا۔ اس "نئے شعور" اور نئی سوچ کا آغاز یہاں اگرچہ ترقی پسند تحریک کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ پھر بھی روایت پسندی یکسر ختم نہیں ہوئی اور نہ دبی۔ روایت پسند ذہن، روایت پسندی کو گلے لگائے ہوئے اس میں تنوع لانے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ گو کہ ترقی پسند تحریک پر پردیسی، اس کے ہم عصر اور ہم خیال دوستوں نے ۱۹۴۱ء سے چلنا شروع کیا تھا، مگر اس تحریک میں جوانی کی لہر آزادی کے بعد دوڑی۔ جب یہاں کے ایک خاص اسکول نے اس کو سیاسی سطحوں پر استعمال کیا اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔

یہاں کے نثر نگاروں کے ساتھ ساتھ یہاں کے شاعروں نے بھی اِس کارواں میں بھرپور حصّہ لیا۔ مہجور ہوں یا آزاد، نادم ہوں یا نازکی، راہی ہوں یا فراق، کامل ہوں یا فانی، عارف ہو یا منظور، پریمی ہو یا حامدی۔ ہر ایک نے اس میں اپنا خونِ جگر ملایا اور نقشِ خام کو پختہ بنا دیا۔

کشمیر میں اردو شاعری کی روایت باضابطہ طور پر تقریباً ڈیڑھ سو سال سے زیادہ پُرانی نہیں ہے، مگر اس قلیل مدّت میں یہاں جس طرح اردو ادب کی آبیاری ہوئی وہ قابلِ ستائش ہے۔ اس نے ترقی پسند تحریک کا بھی ساتھ دیا اور "روایتی" حسن کا دامن بھی نہ چھوڑا۔ جدیدیت سے بھی آنکھیں ملائیں اور تجریدیت کا بھی لبادہ پہنا، علامتی اظہار کو بھی اپنایا اور صوفیانہ و رومانی شعری روایات کی بھی ہم قدم رہی۔ اور آج نئی شعری روایات و رجحانات اور تحریکات سے بھی شانے سے شانہ ملا کر چل رہی ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جس طرح شروع میں اردو شاعری میں بطورِ خاص مثنوی اور غزل مقبول اصنافِ سخن کے طور پر رائج ہوئیں، اسی طرح کشمیر میں بھی غزل اور نظم نے حرفِ آغاز کا درجہ پایا۔ رفتہ رفتہ ان چیزوں سے ہٹ کر یہاں کے شاعروں نے ترقی پسند تحریک تک آ کر موضوعاتی، معری اور آزاد

نظموں نثری نظم کا رواج بھی اپنایا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد جدیدیت نے تمام عالم اُردو کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ تحریک ایک طاقت ور رجحان کے طور پر سامنے آئی اور بڑی تیزی سے اُردو ادب کو متاثر کرنے لگی۔ جدیدیت کے اثر سے اردو دُنیا کے دوسرے مراکز کی شاعری میں جس طرح علامتی، تجریدی شاعری کی مثالیں ملتی ہیں اور ابہام پسندی، جنسی اور نفسیاتی موضوعات اور مسائل کا بے باکانہ اظہار ملتا ہے اور نثری نظم و آزاد غزل جیسی کئی نئی اصناف وجود میں آئی ہیں، ان سب کو کشمیر کی اُردو شاعری نے بھی بڑی حد تک اپنایا ہے، بلکہ ان میں نئے اضافے بھی کئے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کشمیر کی ان خدمات کو بہت زیادہ سراہا نہیں گیا۔ چنانچہ جناب آلِ احمد سرورؔ نے اپنے ایک مضمون "ریاستِ جموں و کشمیر میں بحیثیت سرکاری زبان" میں کشمیر کی اردو تاریخ کو سمیٹتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

"کشمیر میں فارسی ادب کے اثرات کے علاوہ ۱۹ ویں صدی کے اُردو ادب کے اثرات بھی ملتے ہیں اور بیسویں صدی میں تو یہ اس طرح وسعت اور گہرائی اختیار کر گئے ہیں کہ اُردو ادب کی کوئی جامع تاریخ انہیں نظر انداز نہیں کر سکتی۔ اگر اُردو ادب کی اب تک کی تاریخوں میں کشمیر میں اُردو ادب کے فروغ کو نظر انداز کیا گیا ہے تو یہ قصور ان تاریخوں کے لکھنے والوں کا ہے، اُردو کا نہیں۔"

# باب سوم
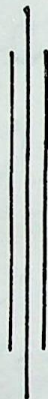
## جدیدیت کے تناظر میں
## ۱۹۶۰ء کے بعد
## اردو شاعری

نظمیں لکھنے کا رواج بھی اپنایا۔ سنہ ۱۹۶۰ء کے بعد جدیدیت نے تمام عالم اُردو کو ہلاکر رکھدیا۔ یہ تحریک ایک طاقت ور رجحان کے طور پر سامنے آئی اور بڑی تیزی سے اُردو ادب کو متاثر کرنے لگی۔ جدیدیت کے اثر سے اردو دُنیا کے دوسرے مراکز کی شاعری میں جس طرح علامتی، تجریدی شاعری کی مثالیں ملتی ہیں اور ابہام پسندی، جنسی اور نفسیاتی موضوعات اور مسائل کا بے باکانہ اظہار ملتا ہے اور نثری نظم و آزاد غزل جیسی کئی نئی اصناف وجود میں آئی ہیں، اِن سب کو کشمیر کی اُردو شاعری نے بھی بڑی حد تک اپنایا ہے، بلکہ ان میں نئے اضافے بھی کئے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کشمیر کی ان خدمات کو بہت زیادہ سراہا نہیں گیا۔ چنانچہ جناب آلِ احمد سرورؔ نے اپنے ایک مضمون "ریاستِ جمّوں و کشمیر میں بحیثیت سرکاری زبان" میں کشمیر کی اردو تاریخ کو سمیٹتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

"کشمیر میں فارسی ادب کے اثرات کے علاوہ ۱۹ ویں صدی کے اُردو ادب کے اثرات بھی ملتے ہیں اور بیسویں صدی میں تو یہ اس طرح وسعت اور گہرائی اختیار کر گئے ہیں کہ اُردو ادب کی کوئی جامع تاریخ انھیں نظر انداز نہیں کر سکتی۔ اگر اُردو ادب کی اب تک کی تاریخوں میں کشمیر میں اُردو ادب کے فروغ کو نظر انداز کیا گیا ہے تو یہ قصور ان تاریخوں کے لکھنے والوں کا ہے، اُردو کا نہیں۔"

# باب سوم

## جدیدیت کے تناظر میں
## ۱۹۶۰ء کے بعد
## اردو شاعری

# جدیدیت کے رجحان کے تناظر میں

## ۱۹۶۰ء کے بعد اُردو شاعری

عصرِ حاضر میں جس قدر تبدیلیاں رُو نما ہوئی ہیں، اُن کا اصل سر چشمہ بہر طور وہ تخلیقی ذہن ہے جو حیات و ممات کے رازوں کو افشا کر کے اُنھیں آج کے عصری حقائق اور مسائل کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ادب کے تعلق سے اشیائے مسائل اور حقائق کو دیکھنے اور دکھانے کے اسی رویّہ کو "جدیدیت" کہتے ہیں۔

جدیدیت کے رجحان نے پُرانی صداقتوں کو نہ صرف نئے معانی عطا کیے، بلکہ نئے معانی دے کر اُنھیں نئی وسعتوں سے بھی ہمکنار کرایا۔ فرسودہ خیالات و تصوّرات کی جگہ، نئے خیالات و تصوّرات نے لے لی۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۰ء کے آتے آتے روایتی رومانی شاعری سے کنارہ کشی اور موضوع و اسلوب کی بے جا جکڑ بندیوں سے شاعری کو آزاد کرانے کا رجحان عام ہونے لگا اور رفتہ رفتہ اس رجحان نے کم و بیش ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی اور اس رجحان کو "جدیدیت" کے نام سے یاد کیا گیا۔ لیکن جدیدیت کی معنویت و اہمیت وغیرہ کے بارے میں مختلف و متضاد باتیں کہی گئیں۔ مثلاً نشاط شاہد اپنے مضمون "جدید غزل میں یوں فرماتے ہیں:

" زندگی اور احساسِ زندگی کی قدیم بُنیادوں پر فکر کی نئی شمعیں روشن کرنا انسان کا محبوب مشغلہ ہے۔ نئی زمانہ زندگی بے حد تیز، برق رفتار، برق آثار۔ فاصلوں اور سمتوں سے بے نیاز ہو چکی ہے ۔"

نشاط شاہد ایک جگہ "جدیدیت" کو سائنسی لائنوں سے یوں ملاتے ہیں :

" سائنس نے تمام پُرانی صداقتوں کو یکسر نئے معانی عطا کئے ہیں، اشیاء عوامل اور اسم و افعال اپنا لبادہ بدل چکے ہیں۔ پوری کائنات، تمام تصوّرات مسلسل تبدیلیوں سے ہم کنار ہیں۔"

محمود سعیدی کے ایک سوال کے جواب میں پروفیسر حامدی کشمیری یوں رقمطراز ہیں :۔

" غالب متشکک ذہن رکھنے کے باوجود "خدائے کہ داشتی داری" کہتے رہے، اقبال مشینی تہذیب کی پیش رفت سے روحانی اقدار کی تباہی سے متردّد رہے، فیض سیاسی جبریت کے شاکی رہے۔ فکشن میں پریم چندر، کرشن چندر اور بیدی طبقاتی مسائل پر لکھتے رہے اور اپنے دلوں کا بوجھ ہلکا کرتے رہے جدید ادب میں اس کے برعکس مفروضوں، نظریوں اور عقیدوں کے جال سے نکل کر حقیقت کی بیکرانی سے متصادم ہونے کا رویّہ زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر وجودی رویّے کے تحت فنکار متخالف کائنات میں اپنے بے مایہ وجود کی آگہی کا کرب جھیل رہا ہے۔ ہاں یہ ادب ان معنوں میں قدیم ادب کی بنیادی اقدار کی بحالی پر زور دیتا ہے کہ یہ معلومات و خیالات کے نظمانے کو نہیں، بلکہ ان کی تخلیقی بازیافت کو اہمیت دیتا ہے۔ شکسپیئر یا غالب کی عظمت (ادبی رنگ میں) اس بات میں پوشیدہ ہے کہ انھوں نے فن کے تخلیقی کردار کی شناخت کی اور اس کا تحفظ کیا۔ نیا ادب ہر حال میں شعر یا فن کے تخلیقی کردار کے استحکام پر زور دیتا ہے۔"

جدید ادبی رجحان کے تحت موضوعات عصری تقاضوں کے پیشِ نظر زیادہ تہہ دار ہو گئے، خیالات کے تہہ در تہہ ہونے سے ایک تو زبان و بیان کی چستی پیدا ہوئی اور

کار آمد در دلبست وجود میں آئے۔ معنی خیزی نے تہلکہ مچا دیا، بصری پیکروں کا عام استعمال ہونے لگا۔ ایک طلسمی فضا پیدا ہوئی، عصری انسانی صورتحال کا اظہار عام ہونے لگا۔ پیکر تراشی، طلسمی صورتِ حال، استعاراتی اظہار، احساسات کی بازیافت، زبان و بیان میں خود روی، سادگی اور سہولت کے عناصر، انفرادیت کے کئی عناصر، زخمی روح کا پھڑپھڑانا اور ایسے کئی محرکات ہیں جو جدیدیت کے رجحان میں اس طرح سمو دئے گئے ہیں کہ اب یہ اس کا جزِ لاینفک بن چکے ہیں۔ ان محرکات و انسلاکات نے جدیدیت کے رجحان کو نہ صرف زندگی بخشی، بلکہ اس میں ایک نئی روح بھی ڈال دی۔ آج جدیدیت اگرچہ بے کراں ہوگئی ہے مگر معنی اور ہیئت کے اعتبار سے اس میں وہ تمام عناصر موجود ہیں، جن سے شاعری لازوال اور بے مثال بن جاتی ہے۔ روح کا دباد باسا احتجاج اور انفرادیت کے خول میں ان گنت "سرمایہ" جدیدیت کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ ان سے ہماری شاعری میں جمود کی کیفیت ختم ہوئی اور شاعر زلف وخال سے نکل کر اپنے تن ومن کی آواز جان سکا۔ نشاط شاہد نے بجا طور پر اسے "اصل تخلیقی ذہن کا سرچشمہ" بتایا ہے[۱]۔ اس سے کئی نئے باب کھل گئے ہیں اور کئی نئے امکانات سامنے آئے ہیں۔ آیئے اب ذرا جدید شاعری کی اصطلاح کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

شاعری کے سلسلے میں "جدید[۲]" کی صفت بطور اصطلاح ہمارے یہاں اس وقت استعمال میں آئی جب آزاد اور حالی نے شعوری طور پر مقصدی، اصلاحی اور افادی قسم کی نظمیں لکھنے اور اس رجحان کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ اس وقت سے لے کر کچھ عرصہ پہلے تک جدید شاعری کے جتنے رجحانات سامنے آئے، ان کے پیچھے زمانۂ حاضر سے متعلق کسی نہ کسی قسم کے نصب العین کا تصور کارفرما رہا ہے، بعض اوقات ایک رجحان دوسرے رجحان کی ضد یا ردِ عمل کے طور پر وجود میں آیا ہے، لیکن اس کے علمبرداروں نے بھی اپنے رجحان کو ایک مسلک یا نصب العین کی شکل دینے کی کوشش کی ہے، اس لئے اس دور کی جدید شاعری اپنی تمام منزلوں اور مرحلوں میں اپنے مسلک یا نصب العین سے ہی پہچانی

---

[۱] "جدید غزل" از نشاط شاہد۔ ص ۹ [۲] "جدید غزل" از خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۱۲

جاتی رہی ہے۔

یہاں اعظمی صاحب نے نصب العین پر زیادہ زور دیا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ وہ نصب العین کو ہی منتہائے مقصد مان لیتے ہیں۔ لیکن یہ اپنی جگہ حقیقت ہونے کے باوجود سب کچھ نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا شاعر نصب العین کے بغیر رہ سکتا ہے؟ اگر رہ سکتا ہے تو کیونکر؟ یا اگر نصب العین کے ساتھ ہی رہ سکتا ہے تو کیا وہ نصب العین ایک جیسا رہ سکتا ہے، کیا وہ پُرانا نہیں بن سکتا؟۔ آج کے اقدار، کل کے فضولیات بھی ثابت ہو سکتے ہیں اور نہیں بھی ہو سکتے۔ میرے خیال میں نصب العین کسی حد تک ضروری تو ہے لیکن شرط لازم نہیں۔ فن کار جس سماج میں رہتا ہے اس سے نباہ بھی کرتا ہے اور کبھی بغاوت بھی۔ وہ اپنی انفرادیت بھی بچانا چاہتا ہے اور اپنے ادراک کو آزاد بھی رکھنا چاہتا ہے۔ وہ خارجی عوامل سے بھی گزرنا چاہتا ہے اور داخلی واردات سے بھی ملنا چاہتا ہے ان تصادمات سے بچنے کے لئے وہ ایک نئی فضا قائم کرتا ہے اور اس کو اپنے لئے محفوظ بھی سمجھتا ہے۔ غرض نصب العین بھی ضروری ہے اور نصب العین فرسودہ نہ ہو جائے اس لئے ایک نصب العین سے چمٹے رہنا مناسب نہیں۔ مقررہ سانچوں اور بنائے ہوئے راستوں پر چلنے یا نہ چلنے سے بہتر یہ ہے کہ ہم ان کو نئے معانی سے تعبیر کریں اور سمتوں پر چلا کر ایک آفاقی وسعت عطا کریں۔

انگریزوں نے ہندوستان میں نئی تعلیم، نئی تہذیب اور نئی فکری صورتوں کو جنم دیا۔ ان سے ہمارے شاعروں کے ذہنوں میں نیا تلاطم پیدا ہوا، ان کی اوہام پرستی، مافوق الفطرت قوتوں پر یقین، رندی اور دیوانگی کے تصوّرات یکسر ختم ہونے لگے، انھوں نے مثبت پہلوؤں اور حقائق سے بھرپور زندگی پر سوچنا شروع کیا۔ سوچنے کا یہ انداز پیچیدہ کبھی نہ رہا، بلکہ اُسی انداز میں پیش کیا گیا، جس طرح محسوس کیا گیا۔ شاعر نے اپنی زندگی کی تلخیوں اور ناہمواریوں کو ردِ عمل کے طور پر پیش کیا۔

جدید شاعری کا یہ مطلب بھی نہیں لیا جا سکتا کہ اس کے تحت شاعر ہمیشہ مفید، صحت مند اور کامیاب فن پاروں کو ہی جنم دے سکتا۔ بلکہ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ

جدید فن پارے کبھی کبھی غیر اعتمادیت کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔ دراصل محض نقالی سے فن میں پختگی نہیں آتی۔ پختگی کے لئے ریاض اور سخت مشق کی ضرورت ہے اور جب تک شاعر مسلسل اور مدلّل کوشش نہیں کرتا اس کا فن، فن نہیں کہلا سکتا، چاہے وہ کسی بھی رجحان سے منسلک کیوں نہ ہو۔ جدید شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُس نے فارموں اور خانوں سے اپنے آپ کو آزاد رکھا ہو اور وقتی نصب العین بھی نہ اپنایا ہو، اور نہ ہی وہ نفی و اثبات کے سانچے و کسوٹی کے طور پر استعمال ہوتی ہو۔ وہ دراصل اپنے مافی الضمیر کی دریافت میں مصروف ہوتی ہے اور جب تک وہ زندگی کی حقیقتوں سے آنکھ نہیں ملاتی، چین سے نہیں بیٹھتی۔ زندگی چونکہ غم و اندوہ، امیدی ناامیدی، خوشی نفرت و محبت، ہجر و وصال، اور قربت و دوری سے عبارت ہے، اس لئے یہ ایک ہی کل نہیں بیٹھ سکتی۔ اس میں اُبال آنا لازمی ہے۔ اس پیچیدگی سے کھیلنے میں جدید شاعری کو لُطف آتا ہے۔ جدید شاعری میں یہ بھی خصوصیت ہے کہ اس کو ہم کسی مخصوص خانے میں قید نہیں کر سکتے، اور نہ ہی اس پر کوئی لیبل چسپاں کر سکتے ہیں۔

"نئے شاعر نے واعظ ہی نہیں عاشق، رند، رومانی، باغی، مبلغ، مجاہد، انقلابی اور اشتراکی سب کے نسب نامے کو پھر سے ایک بار آدم کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے اور آدمی کے چہرے سے اوپری خول اُتار کر اس کے باطن میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔" [۱]

زندگی کے لاتعداد مسائل مرکزیت و اولیت کو سمجھنا اور سمجھ کر پرکھنا اور پھر اس کو فن کے سانچے میں ڈھالنا، جدید شاعری کی دین ہے۔ یہی خیال نئی شاعری کے طرف دار ظاہر کرتے ہیں۔ آج کا شاعر ایک چیز، ہر ایک واقعے اور ہر ایک جذبے کو انسانی عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتا ہے اور پھر اس کو برملا اور

---

[۱] "معیار" از خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۱۹

بیباک انداز میں لفاظیت کی علت کے بغیر پیش کرنا چاہتا ہے۔ یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ وہ اپنے باطن میں جھانکنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اندرون کو بیرون سے ملا کر نئی جہتیں پیدا کرتا ہے۔ جذبات اور محسوسات کو ہو بہو اسی طرح ادا کرنا چاہتا ہے، جس طرح اُسے "اندر کا آدمی" اُکساتا ہے۔

"جدیدیت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عقلیت اور غیر عقلیت ہم آمیز ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدیدیت ٹیکنالوجی کے استعمال کی تائید بھی کرتی ہے اور مذمت بھی۔ جہاں وہ کلچر کے پرانے دور کے خاتمے کا اعلان کرتی ہے، وہیں تاریخیت اور وقت کے دباؤ کی موجودہ کیفیت سے خوفزدہ بھی ہے۔ یہ رویّہ اُسے فطرت نگاری، عقلیت پسندی، حقیقت پسندی اور رومانیت سے ممیز کرتا ہے۔" [۱]

جہاں تک عقلیت اور غیر عقلیت کے ہم آمیز ہونے کا سوال ہے، یہ حقیقت ہے کہ کبھی کبھی جدیدیت، عقلیت سے ذرا دور بھی ہو جاتی ہے۔ مگر یہ صورتحال زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی، بلکہ ایسا ہونا ایک وقتی اُبال ہے اور اُبال چند پلوں کا مہمان ہوتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا ذرا اچھا نہیں لگتا کہ جدیدیت، غیر عقلیت میں پائی جاتی ہے۔ اگر جدیدیت غیر عقلیت یا محض "خیالی محوروں" کے گرد گھوم گئی ہوتی تو کب کی یہ فرسودہ ہو چکی ہوتی۔ اس میں شروع سے آخر تک عقلیت ہی عقلیت نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدیدیت نے "خیالی دُنیا" کو حقیقی دنیا کے سامنے لا کر ایک طرح سے ننگا کر دیا ہے۔ رہی بات وقت کے دباؤ کی موجودہ کیفیت سے خوفزدہ ہونے کی، تو میرے خیال میں خوفزدہ وہی ہوتا ہے جو شعوری طور پر چلتا ہو، اور شعوری طور پر عقلیت کے پاسبان ہی چلتے ہیں۔ اس لئے خوفزدہ ہونا عقلیت کے شریکِ کار ہونے کی دلالت ہے۔ بالفاظ دیگر یہ عقل ہی ہے جو انسان کو مستقبل کے لئے اعتماد کی لوریاں سُناتی ہے یا خوفزدگی پیدا کرتی ہے، میرے خیال میں جدیدیت میں غیر عقلیت

[۱] جدید اردو غزل "از مغنی تبسم" ص ۹۳

کا گزر بہت ہی دشوار ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں مغربی نقادوں نے متفقہ طور پر یہ اعلان کیا کہ یہی جدیدیت کا زمانہ ہے، مگر جدیدیت کے مفہوم کے بارے میں ان میں اتفاق رائے نہیں ہو پایا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے سامنے یہ ہر عہد میں بدلتی رہی اور اس کے مفہوم بھی بدلتے رہے، کہیں اسے حقیقت نگاری کہا گیا تو کہیں تاثریت (IMPRESSIONISM) کہا گیا۔ ایک طرف سے (CUBISM) مانا گیا تو دوسری طرف (SYMBOLISM) کے طور پر پیش کیا گیا۔ غرض ذہن کی آزادانہ روش کو چاہے وہ تاثراتی ہو یا رمزیہ ہو یا ماورائی ہو، جدیدیت سمجھا گیا۔ حالی نے جس کے بیج بو دئے تھے اور اقبال و فراق نے جس کو جہتیں عطا کیں، بعد کے شاعروں نے اس میں نئے تجربوں سے نئی نئی وسعتیں پیدا کیں۔

"ہاں خوشی کا یہ مقام ہے کہ فن کار نے حقیقت سے کام لے کر دروں بینی کی کامیابی سے اس کو آگے بڑھایا، اور آگے بڑھانے کی دوڑ ابھی بھی قائم ہے"۔ [۱]

آیئے! اب ذرا "جدیدیت" کے علمبردار شعراء کے کلام کو دیکھیں اور اُسے سمجھنے کی کوشش کریں تاکہ جدیدیت مثالوں سے خود بخود آشکار ہو جائے۔ روایتی غزلوں میں ہمیشہ محبوب کو ستم گر اور عاشق کو ستم رسیدہ دکھایا گیا، لیجئے نئی حقیقت سے بھی آنکھیں ملایئے! جہاں محبوب کو بھی ایسی کیفیتوں سے دوچار دکھایا گیا ہے، جو آج تک صرف عاشقوں کے ہی نصیب میں لکھی ہوئی تھیں :-

تو کون ہے، تیرا نام ہے کیا
کیا سچ ہے کہ تیرے ہو گئے ہم

(ناصر کاظمی)

---

[۱] کم و بیش نشاط شاہد، ناصر کاظمی، خلیل الرحمن اعظمی، اطہر پرویز اور ڈاکٹر حامدی کاشمیری، پروفیسر آل احمد سرور اور ڈاکٹر عبداللہ لاہوری سب اس کی تائید کرتے ہیں، صرف احتشام حسین اس سے ہٹ کر سوچتے ہیں۔

آگے آگے کوئی مشعل سی لئے چلتا تھا!
ہائے کیا نام تھا اس شخص سے پوچھا بھی نہیں

(شاذ تمکنت)

نہ جس کا نام ہے کوئی، نہ جس کی شکل ہے کوئی
ایک ایسی شے کا کیوں ہمیں ازل سے انتظار ہے

(شہریار)

آج کی غزل میں ماحول، فطرت اور اس کے مظاہر علامت بن کر سامنے آتے ہیں:

بین کرتی ہے دریچوں پر ہوا — رقص کرتی ہیں سیہ پرچھائیاں

(سلیم احمد)

چلا ہے مجھ سے آگے مرا سایہ — سو میں بھی ساتھ چلتا جا رہا ہوں

(سلیم احمد)

رین اندھیری ہے اور کنارہ دور — چاند نکلے تو پار اتر جائیں

(ناصر کاظمی)

فصیلِ جسم پر تازہ لہو کے چھینٹے ہیں! — حدودِ وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی

(شکیب جلالی)

ایک مدت سے چراغوں کی طرح جلتی ہیں — ان ترستی ہوئی آنکھوں کو بجھا دو کوئی

(ساقی فاروقی)

مختصراً اتنا کہنا کافی ہے کہ جدیدیت تب کھل کر سامنے آئی ہے، جب یہ زمانے کی روح سے ہم آہنگ ہو کر تازگی پیدا کرتی ہے۔ زمانے کی دیواروں میں وہ قید نہ ہو تاکہ آنے والا کل اُسے "باسی" نہ سمجھے اور پرانی نہ ہو جائے۔ اس کا باطن آفاقی روح سے ہم آہنگ ہو جو شاعری کو ہر دور میں "زندہ" رکھے اور مقامِ جاوداں دے۔ یہ رہی ملک گیر جدید شاعری کی صورتحال، اب ذرا اس کے تناظر میں کشمیر کی اردو شاعری سنہ ۱۹۶۰ء کے بعد کا جائزہ لیں۔

کہا جاتا ہے کہ جدیدیت سنہ ۶۰ء کے بعد شروع ہوئی۔ لیکن میں کشمیر کے کئی مقتدر شعراء سے

ملا، اُن کا کلام دیکھا اور اس کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ کشمیری شاعروں نے بھی جدیدیت کو شروع میں ہی اپنا لیا تھا اور اس میں نت نئے تجربے کئے تھے۔ جدیدیت ہند میں ۱۹۶۰ء کے بعد ہی نظر آئی، جبکہ یہاں (کشمیر) کے اکثر شعراء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سارے ملک سے پہلے جدیدیت کو نہ صرف اپنا لیا تھا بلکہ اس میں مختلف النوع کے تجربوں تک بھی آ گئے تھے۔ آیئے ذرا ان مثالوں کو دیکھیں جو اس سلسلے میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

(۱)

جاگتے لمحوں میں تلخابۂ شیریں کے سبو　　رات کا دل بھی نگلتا ہے ہمیشہ جادو

(۲)

تلخیٔ زیست کے اسباب پہ انگلی رکھ دوں　　اپنے آقاؤں سے دو چار سوالات کروں

(۳)

کر رہا ہوں طے خلا کے راستے　　پھر بھی جنوں میرا بے سود ہے

(۴)

بدلنا ہے مجھے اے عرشؔ زندگی کا نظام　　بلا سے لاکھ رسومِ کہن کے پہرے ہوں

(۵)

مئے فریب و دغا اب مجھے درکار نہیں　　مئے خلوص و وفا سے بھرا ہے دل کا جام

(۶)

برقِ جمالِ طور سے بے خود ہوئے کلیمؑ　　میں کھیلتا ہوں ایسے نظاروں سے رات دن

(۷)

ہستی کے تقاضے نا واجب!　　ایمائے اجل بے ہنگم ہے
کچھ ربط دماغ و دل میں نہیں　　اے مشقِ سخن اب کیا ہو گا

(۸)

خونبار شفق ہے، کیا جانے　　کتنوں کا سہاگ اترا دن میں

---

۱. قیصر قلندر ۲. رآبی ۳. ہمدم ۴. ... ۵. ... ۶. عرش ۷. آبر ۸. شہزور (۱۹۶۰ء سے پہلے کا کلام)

ہے شام کے سر پر کالا کفن ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ اے شب کی دلہن اب کیا ہوگا

(شہزور)

(۹) ‏ دل کے دروازے پہ دستک دے رہا تھا کون تھا

جھانک کر دیکھا کوئی چہرہ، کوئی پیکر نہ تھا

(ایرج)

قطع نظر اس کے کہ یہ مثالیں پوری کی پوری "جدیدیت" کی کسوٹی پر کھری اُترتی ہیں یا نہیں، یہ بات مسلمہ ہے کہ ان سب میں جدیدیت کا مزاج پایا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ۱۹۶۰ء سے کچھ سال ہی پہلے جدیدیت کا رجحان کشمیر میں پلا، بڑھا اور جوان ہوا۔

۱۹۶۰ء سے جو ملک گیر ادبی فضا قائم ہوئی اُس کو جدیدیت کا نام دیا گیا۔ اس کے تحت مُلک گیر پیمانے پر ادب میں نئے موضوعات اور نئے اسکول کُھلنے شروع ہوئے۔ ملک بھر کے ادیبوں اور شاعروں نے نئے راستوں پر چل کر نئی سمتوں کی نشاندہی کی اور کشمیر کا ادیب و شاعر بھی ان تبدیلیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ طرح طرح کی ادبی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ یہاں کے نئے اور پرانے شاعروں نے بھی "حالات" کے پیشِ نظر اپنی سوچ، اپنی فکر اور اپنے لہجے میں تبدیلی پیدا کی۔ جذباتیت اور "نعرہ بازی" کو خیرباد کہا گیا۔ اُس کی جگہ حقیقت پسندانہ لائنوں پر سوچا جانے لگا۔

یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ ان دنوں تمام ملک کی اردو شاعری سیاسی اور فکری انقلاب سے دوچار تھی۔ اس لئے کشمیر میں بھی اس نے ان انقلابات کو جگہ دی بلکہ اس کی تمام تر جہتیں منظرِ عام پر لانے کی کوششیں کیں۔ روایتی اور رومانی شاعری کا چلن ختم ہوا، اس کی جگہ اُسلوب کی جکڑبندیوں سے آزاد ہو کر ایک نئی وسعت اختیار کر گئی۔ موضوعات، عصری تقاضوں کے پیشِ نظر زیادہ پُر معنی اور تہہ دار ہو گئے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے جس شاعر نے یہاں شروعات کی اُس کا نام نامی حبیب اللہ حامدی کاشمیری ہے۔ اس طرح یہ کہنے میں کسی پس و پیش کی ضرورت نہیں کہ حامدی کاشمیری ہی کشمیر میں جدیدیت کے بانی مبانی ہیں۔ ... جدید

پر سوچنا شروع کیا تھا۔ وہ "پورے طور" پر حقیقت پسندانہ نہیں دکھائی دیئے۔ اس ضمن میں جناب منیب الرحمٰن کی یہ رائے مستحسن اور معتبر قرار دی جاسکتی ہے کہ:

"نئی شاعری کے سلسلے میں جس کی ابتدا ریاست میں ۶۵ء[1] کے بعد ہوئی حامدی کاشمیری نے پیش رفت کی۔ روایتی رومانی شاعری نے کنارہ کش ہو کر انھوں نے موضوع اور اسلوب کو بے جا جکڑ بندیوں سے آزاد کرا کے نئے شعری تقاضوں کے مطابق کر دیا۔ ریاست کی نئی اردو شاعری کے نمائندہ شعراء کی فہرست میں حامدی کاشمیری سب سے آگے ہیں۔"

یہ حقیقت ہے کہ حامدی کاشمیری ریاستِ جموں و کشمیر میں جدید شاعری کے ہراول دستے میں نظر آتے ہیں، اُن کا منفرد اسلوب "جو نایافت[2]" سے ظاہر ہے ان کی وسعتِ نظری اور "دل کے سفر" کا ہمسفر ہوتا نہ صرف اُن کو جدید شاعروں کا نمائندہ شاعر بناتا ہے، بلکہ اُن کو "نئے راستوں" کا پیامبر بھی بنا دیتا ہے۔

حامدی صاحب ایک مخصوص شعری اظہار کے لئے ملک بھر میں منفرد مقام رکھتے ہیں، حامدی صاحب کے پاس اگرچہ موضوعات کی زیادہ فراوانی نہیں، مگر ان میں طلسمی صورتحال تخلیق کر کے وہ انفرادیت میں کھو کر پیکر تراشی اور استعاراتی اظہار کو جنم دیتے ہیں۔

وہ قدرت کی بنائی ہوئی چیزوں کو اس طرح علامتی لباس پہناتے ہیں کہ وہ چیز ساکن ہو کر بھی متحرک لگتی ہے۔ وہ شعروں میں "تخلیق کرنے کے روادار ہیں "تحیر انگیز تخلیق کردہ طلسمی دنیا کا اہم عنصر ہے[3]"۔ وہ عصری اظہار کے ہر پہلو پر نظر رکھتے ہیں اور نتیجے کو برملا کہہ دیتے ہیں۔ حیات کی بے ثباتی، کھوکھلا پن اور بے معنویت ان کے اشعار میں اکثر ہویدا ہوتی ہے۔

پرندے اب کہاں وحشت نوا ہیں! وہ لے آئیں گے زیرِ دام کس کو

---

[1] یہ درست نہیں ہے۔ یہاں (کشمیر میں) تو ۶۰ء سے بھی پہلے نئی شاعری کا اتہ پتہ ملتا ہے۔

[2] حامدی کاشمیری کا شعری مجموعہ۔

[3] "نئی شاعری" از منیب الرحمٰن ("تعمیر" کا جموں و کشمیر ادب نمبر۔ اگست ۸۳ء)

کتنے سورج تہوں میں اُترے تھے　　فصلِ انجم سمندروں میں نہیں

بصری پیکروں کا استعمال اور اُن سے معنی خیزی کی تخلیق حامدی صاحب کا محبوب مشغلہ ہے۔

لاکھ کہتے رہے اس دیس کا کچھ حال لکھو　　تکتے تھے چہروں کو آمادۂ گفتار نہ تھے

∴

ردائے برف میں سنگ و شجر ہوئے روپوش　　وہ عیش گاہوں میں کیا کیا گناہ کرتے رہے

∴

نکل آئے ہو تہہ خانوں سے آخر　　کہو تم میں ہوا الہام کس کو

غرض ان کی شاعری، عصری زندگی کی ستم سامانیوں کے شدید احساس کی روداد ہے۔ ان کے بعد جدید شاعروں کی دوسری صف میں یہاں[1] مندرجہ ذیل شعرا نظر آتے ہیں، جنہوں نے روایتی اور رومانی شاعری کے ساتھ ساتھ جدید شاعری کے مزاج کو بھی قبول کیا اور اس میں نئی سمتوں پر آگے ہی آگے رواں دواں ہوئے۔ جدیدیت کی اس صف میں حکیم منظور، منظر ایرج، شجاع سلطان، معود ساموں، رخسانہ جبیں، واجدہ تبسم، رفیق راز وغیرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

کشمیر کی جدیدیت کی تحریک پر نور شاہ اپنی کتاب "انتخابِ اُردو ادب" میں یوں رقمطراز ہیں:

"اردو لکھنے والوں پر ان نئے تقاضوں کا براہِ راست اثر ہوا اور اُن کی تخلیقات بھی اپنے نئے تقاضوں کا ساتھ دینے لگیں۔ اِس دوران کہنہ مشق لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ کچھ نئے نام سامنے آنے لگے، اِن میں خاص طور پر قابلِ ذکر فاروق نازکی، فرحت گیلانی اور صادق علی اسیر ہیں۔"[2]

---

[1] مراد جموں و کشمیر ہے



[2] "انتخاب اردو ادب" از نور شاہ

"ایوانِ اردو" میں یوسف ٹینگ صاحب کشمیری ادیبوں کی پذیرائی کا اس طرح ذکر کرتے ہیں:

"ایوانِ اردو میں موجودہ دور کے کشمیری ادیبوں کی پذیرائی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ جدیدیت کی لَے اُردو میں تقریباً بیک وقت ساری جگہوں پر سُنی گئی اور اس کی بازگشت بھی ہر جگہ ہوئی۔"[۵]

آیئے اب ہم "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر آپ کو کشمیر کے جدید اُردو شاعروں کے کچھ اشعار سُناتے ہیں، جن کو ہم فخریہ طور پر اُردو کے بڑے ایوانوں میں پیش کر سکتے ہیں۔ یہ اشعار نہ صرف جدیدیت کا مزاج و لباس اور عصری عناصر رکھتے ہیں، بلکہ ان سے جدیدیت میں نئی جہتیں اور سمتیں منظرِ عام پر آئی ہیں۔

(۱)

ریت میں کھو جانے سے پہلے وہ پلکیں کھولتے
دشت میں بھی خواب آسودہ صنوبر دیکھتے

(۲)

پھر چاہتے ہوئے بھی میں واپس نہ آسکا
دریا جب اپنے ساتھ بہالے گیا مجھے

(۳)

حدّت اتنی سوزِ نہاں کی
جلتی آگ نے کھائی مات

(۴)

وہ سو یا سنگ سنگ ارادوں کو اوڑھ کر
اور مجھ کو آنکھ آنکھ بکھرنا ہے رات بھر

---

۵۔ پیش لفظ "کشمیر میں اردو"، یوسف ٹینگ

(۵)

کروں گی میں چراغاں ترے جزیرے کو
مرے صدف کے مقدّر میں تو سیاہی لکھ

(۶)

میں اپنے اندر شریر لڑکا لئے چلا ہوں
میرے قریب وجوار میں کیا نمائشیں ہیں

(۷)

خاموشیوں کے زرد تکلم سے ڈر کے وہ
اِک اَن سُنی صدا کا طرفدار بن گیا

(۸)

اِک دھوپ کی جادوگری ہے، پانی پر نقش بناتی ہے
دیکھو تو یہ دُنیا سب کچھ ہے، سوچو تو یہ دُنیا کچھ بھی نہیں

(۹)

اُسی کے ذکر سے روشن ہیں بام ودر اپنے
اگر سُنے گا تو سب روشنی بجھا دے گا

---

۱۔ حامدی کاشمیری ۲۔ پرتیپال سنگھ بے تاب ۳۔ نشاط انصاری ۴۔ مسعود سامون
۵۔ رخسانہ جبیں ۶۔ خالد بشیر ۷۔ حکیم منظور ۸۔ محمد یٰسین ۹۔ شجاع سلطان

# باب چہارم

## ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء تک کشمیر کی اردو شاعری

* اہمیت
* انفرادیت
* خوبیاں
* خامیاں !
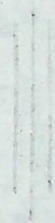
# ۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۰ء کے دوران
# کشمیر کی اُردو شاعری کی اہمیت،
# انفرادیت، خوبیاں اور خامیاں!

"آزادی اور اپنی قسمتوں کے مختار آپ ہونے کے احساس کے ساتھ ساتھ اپنی زبانوں کی طرف توجہ ایک فطری بات ہے۔ یہ احساس کشمیر میں پچھلے عہد سے بیدار ہونے لگا تھا، جس کے آثار مہجور اور اُن کے ہم عصر کچھ شاعروں کے یہاں ملتے ہیں"۔[1]

یہ حقیقت ہے کہ آزادی نہ صرف سیاسی، سماجی اور اقتصادی آزادی لاتی ہے، بلکہ اس سے فکر و فن میں بھی ایک انقلاب آتا ہے۔ کشمیر کی آزادی نے جہاں لوگوں کو پسماندگی سے اُٹھانے کی کوشش کی، وہیں یہاں کے ادیبوں نے مشترکہ طور پر ایک ایسی سعیٔ پیہم کی جس سے یہاں کے ذہنوں پر طاری جمود ختم ہوا اور "نئی صبح" کی خوشگوار کرنیں منظرِ عام پر آئیں۔ حکومت کی طرف سے اپنی اپنی زبان[2] کو سجانے اور سنوارنے کے لئے حوصلہ افزائی کے مراکز[3] قائم ہوئے، ان سینٹروں نے ممکنہ حد تک یہاں کے ادیبوں کو مالی معاونت سے نہ صرف نوازا بلکہ ان کی نئی تخلیقات کے ذریعے، نئے ادب کو بھی عام کیا۔ کشمیر کے ادیبوں

---

[1] "کشمیر میں اردو" از پروفیسر عبدالقادر سروری ص ۲۳ (جلد ۳)

[2] مراد کشمیر کی مختلف زبانیں۔

[3] یعنی کلچرل اکیڈمی، محکمۂ تعلقات عامہ و اطلاعات۔

نے کشمیری زبان میں بھی لکھنا شروع کیا اور اتنا لکھا کہ صدیوں کی کسر نکالی۔

اسی طرح جموّں کے ڈوگری ادیبوں نے ڈوگری شعروادب میں بیش بہا اضافے کئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کشمیر میں "کشمیری" اور جموّں میں "ڈوگری زبانیں ننھے پودوں سے تناور درختوں میں مبدل ہوئیں۔

"لیکن اس دور میں بھی کئی باہمت اہلِ قلم نے اردو کی وسیع تر ادبی دنیا میں اپنی مخصوص ذہانت اور فن کے نقش بٹھائے اور جو کل ہند ادبی تصویر میں اپنے موقلم کی رنگ کاری کی شانِ عمل کو نمایاں کرنے میں اب بھی مصروف ہیں۔"[1]

ان باہمت قلم کاروں نے روایتی، رسمی اور رومانی دنیا سے ادب اور فن کو نکالنے کی کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ انفرادی، سماجی اجتماعی تقاضوں سے زندگی کی گرہیں کھولنے پر زور دیا گیا۔ اگرچہ اس دور میں بھی روایت کا پاس و لحاظ باقی رکھا گیا، مگر زیادہ جُھکاؤ ترقی پسندی کی طرف رہا۔ ۱۹۴۱ء میں پردیسی نے یہاں[2] ترقی پسندی کی بنیاد ڈالی۔ مہجور، ساگر، نادم[3] اور دوسرے ادیبوں نے اُن کا ساتھ دیا۔

اس طرح ترقی پسند تحریک شدومد سے رواں دواں ہوئی۔ اس تحریک کا زور جب ۱۹۴۶ء میں ذرا کم ہوا تو یہاں کے ادیبوں نے "حلقہ اربابِ ذوق" کا قیام عمل میں لایا۔ اس حلقے نے ادب اور فن کو کئی شعبوں میں تقسیم کر دیا۔ نتیجے کے طور پر کئی تھیٹریکل انجمنیں اور کلب معرضِ وجود میں آئے۔ بعد میں یہ حلقہ "اربابِ ذوق"، "انجمن ترقی پسند مصنفین" میں مدغم ہو گیا اور اس ادغام کے بعد جلسوں اور مشاعروں کا دور آگیا۔ اس دور کا سلسلہ کم و بیش آج

---

۱۔ "کشمیر میں اردو" از عبدالقادر سروری۔ ص ۲۳۔ جلد ۳

۲۔ یہاں مراد ہے کشمیر میں۔

۳۔ غلام احمد مہجور، راماننددت ساگر، جہند رینہ، دیناناتھ نادم۔

تک دائم و قائم ہے۔

آزادی سے پہلے یہاں ہمیں صوفیانہ، رومانی اور ترقی پسند شعری روایات ورجحانات اور تحریکات کا غلبہ نظر آتا ہے۔ آزادی کے بعد ان کی جگہ صرف ترقی پسند تحریک نے لے لی اور پھر کئی سالوں کے بعد جدیدیت کا رجحان کشمیر کی اردو شاعری پر حاوی ہو گیا۔

آیئے اب ذرا سنہ ۱۹۴۷ء سے سنہ ۱۹۶۰ء تک کی کشمیر کی اردو شاعری پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھیں۔

سنہ ۱۹۴۶ء میں کشمیر ایک سیاسی بیداری کے دہانے پر تھا، آزادی کے ترانے گونج رہے تھے، اقتصادی بدحالی کا خاتمہ ہو رہا تھا، غلامی کے صدیوں پرانی زنجیریں کٹ رہی تھیں، شاعری میں ترقی پسندی کا خون رواں دواں تھا، حقیقت پسندی کا ہر طرف شور تھا۔ صوفیانہ شاعری اور رومانی شاعری کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ مقصدی شاعری کا بول بالا تھا۔ کشمیر سے باہر کرشن چندر، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، ملک راج آنند، سجاد ظہیر اور راجندر سنگھ بیدی وغیرہ "ادب برائے زندگی" کے گن گا رہے تھے۔

یہاں[1] پریم ناتھ پردیسی، رامانند ساگر، ماہ، مہجور وغیرہ کلچرل کانگریس کو "مقصدی لائنوں" پر چلا رہے تھے، نادم، راہی، فراق اور ان کے دیگر ہمعصر اس کارواں میں بڑے کرّوفر سے ان کے ہمسفر تھے۔ ترقی پسندوں کے اس کارواں نے شاعری کو زلف وخال، لب ورخسار، حسن وعشق، رندی ودرویشی سے نکالا اور اس کو انسان کی اقتصادی اور معاشی صورت حال سے جوڑ دیا۔

گویا شاعری میں سیاست کا چلن ہوا۔ سیاست کے آجانے سے نعرہ بازی کا زمانہ آیا۔ نعرہ بازی نے جذباتیت کو جنم دیا، شعری نزاکتوں اور موشگافیوں کو بالائے طاق رکھ دیا گیا اور مقصدیت کے نام پر ہر نعرہ روا رکھا گیا۔ اس طرح فنی غلطیاں

---

[1] یہاں مراد کشمیر میں۔

سیاست اور جذبات میں گم ہو گئیں ۔ بقول محمد یوسف ٹینگ :۔

" اشتراکی رجحان کا اثر گہرا اور ترقی پسند تحریک کی گرفت بیحد سخت تھی، بلکہ ایک باقاعدہ تنظیم کلچرل کانگریس کے نام سے قائم تھی۔ جہاں فنی موشگافیوں کو سلجھانے کی بجائے، سیاسی صف بندی (REGIMENTATION) کی ہدایات جاری تھیں[له]"

یہاں یہ بات صاف ہوتی کہ ۱۹۴۷ء میں پرانی شعری تحریکات ختم ہوئیں اور مقصدی شاعری کا چلن ہوا۔ گویا شاعری حضرت انسان اور اس کے ارد گرد چلنے لگی۔ مگر ترقی پسندی کا سب سے بڑا نقصان جو ہوا وہ یہ کہ شاعر، شاعر سے زیادہ سیاست داں لگنے لگا، اس کی بات جذباتیت سے پُر اور نعرہ بازی کے مترادف لگنے لگی، وہ طبقات میں کھو گیا، فن اور فکر میں ہیجان انگیزی آئی۔ سرمایہ دار اور مزدور کی باتیں کرتے کرتے شاعر ایک عوامی جلسوں کا لاوڈ اسپیکر (LOUD SPEAKAR) بن گیا۔

لیکن اس دور نے (ترقی پسند) ہیئت اور فارم پر جتنے تجربے کئے کسی اور دور میں نہیں کئے گئے ۔ یہ اس تحریک کا ہی حاصل ہے کہ شاعری میں نظمِ معریٰ، نظمِ مرجز، آزاد نظم، سانیٹ، مسدّس، رباعی، قطعے اور کلاسیکی وغیر کلاسیکی اصناف میں منظومات کے انبار لگ گئے ۔ شاعری میں ترنّم کی جگہ جذبۂ دروں، تصوّف کی جگہ رجزیہ انداز، شاداب اور امیجزی انداز آ گیا۔ اگرچہ یہ تجربے نئے تھے، لیکن تھے نہایت دلفریب، بندھی ٹکی تشبیہات، فرسودہ استعارات، رمز و کنایات کو یکسر ختم کیا گیا۔ ان کی جگہ زندگی کے روزمرّہ جزئیات سے کام لیا گیا ۔

ترقی پسند تحریک سے سب سے بڑا فائدہ جو کشمیر کی اردو شاعری کو

---

له ۔ "کشمیر میں اردو" کے پیش لفظ میں یہ سطور ٹینگ صاحب نے رقم کی ہیں ۔

پہنچا، وہ ہے پیکر تراشی اور نرم گرم زندگی سے بھرپور پیار۔ انگریزی کی معنی خیزیت اور ہندی کے رس کو اس طرح اردو شاعری میں لایا گیا کہ اردو زبان کی شاعری کی بالغ نظری، وسعت اور علمی بصیرت و بصارت میں مزید اضافہ ہوا۔

اس طرح (VOCABULARY) اور مرقعوں کا بھی ایک بلیغ انبار لگ گیا۔

ترقی پسندی کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اس نے شاعری کو محض سماع کی چیز سے نکال کر اس کو زندگی سے قریب کر دیا۔ شاعری الہام سے زیادہ "سوچ" بن گئی اور اس میں زندگی کی جیتی جاگتی روح نظر آنے لگی۔

تیسری سب سے اہم خوبی، جو ترقی پسند تحریک سے اردو شاعری میں آئی، وہ یہ تھی کہ شعر و ادب میں ذخیرۂ الفاظ وافر مقدار کے ساتھ مردانہ آہنگ، جنگجویانہ جلال اور خطیبانہ رجز کے نئے سُر گونجنے لگے۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک جو اصنافِ سخن روایتی دور کے بعد زیادہ مقبول ہوئیں، اُن میں نظم، نظمِ جدید اور نظمِ معریٰ قابل ذکر ہیں۔ روایتی دور میں غزل اور مثنوی کی دُنیائے شاعری پر حکمرانی تھی، ترقی پسند دور میں ان کی جگہ آزاد نظموں اور نظمِ رجز نے لے لی۔ گویا ساری اردو شاعری کے کینوس نہ صرف بڑی حد تک تبدیل ہوئے، بلکہ انھیں نئے رنگ اور نئے ڈھنگ سے سجایا گیا۔ ابہام اور ایہام کی نت نئی صورتیں سامنے آنے لگیں، انگریزی اور ہندی کے اثرات بھی بڑھ گئے۔ BALLAD جیسی نظموں کا چلن عام ہوا۔

غزل میں حیرت ناک تبدیلی آئی۔ زلف و خال، لب و رخسار، حسن و عشق، پیار و محبت، ہجر و وصال، افسردگی اور یاس، جلوت و خلوت سے زیادہ اب زندگی کی تلخ کامی، غمِ روزگار کی ستم رانی اور غمِ دوران کا بیان ہونے لگا۔ چھوٹی غزلوں کے ساتھ ساتھ، غزلِ مسلسل کا رواج بھی ہوا۔ مسدس کا زور بھی بڑھا۔ غرض اردو زبان و ادب میں ایک دلفریب انقلاب آیا، جس نے نہ

صرف پرانے اسالیب کو نئی جہتیں عطا کیں، بلکہ اس میں خاطر خواہ اضافہ بھی کیا
سنہ ۱۹۴۰ء کے آس پاس جدیدیت ایک طاقت ور رجحان کے طور پر ابھر کر
سامنے آئی۔ اس نے شاعری کے انگ انگ کو جھنجھوڑا، اعصابی تناؤ کو ڈھیلا
کیا، آدرش وادیت کا نقاب اُلٹ کر رکھ دیا۔ بیرونی واردات سے زیادہ،
اندرونی یا داخلی واردات کا نظارہ کرایا۔ روس میں جب DESTALIZATION ہوا تو
آدرش وادیوں اور اشتراکیوں کو ایک ذہنی جھٹکا لگا۔ اُن کی سوچ پر ایک برقِ
ناگہانی گری، ان کا ذہن اس اچانک حملے سے کئی سالوں تک ماؤف رہا۔ وہ
اپنی ذہنی دنیا اُجاڑ دیئے جانے کے لیئے آمادہ نہ تھے۔ راہی اور ناؔدم جیسے
کہنہ مشق اور اہم شاعر کئی سالوں تک اس "واردات" کی بناء پر خاموش رہے۔

# باب پنجم

## جمّوں و کشمیر میں اُردو زبان و ادب کی صورتِ حال

# جموّں و کشمیر میں
# اُردو زبان و ادب کی صورتِ حال

اُردو کشمیر میں فارسی کے بعد آئی اور فارسی سے پہلے یہاں سنسکرت کا راج تھا۔ ہر زبان نے اپنے اپنے اثرات چھوڑے اور ہر اثر نیا جامہ پہن کر چمکنے اور دمکنے لگا۔ تاثر اور تخلیق میں چونکہ چولی دامن کا واسطہ ہوتا ہے اس لئے زبان و ادب بھی کے سہارے چلتے ہیں۔ تاثر کچھ کرنے کے لئے اُکساتا ہے اور تخلیق جنم لیتی ہے۔ کشمیر میں سنسکرت کا تاثر فارسی پر رہا اور فارسی نے اُردو پر اپنے تاثر کو برقرار رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر میں فارسی تخلیقات پر سنسکرت کا خاطر خواہ اثر نظر آتا ہے۔ شہمیری خاندان (۱۳۳۹-۱۵۸۶ء) رخصت ہوا تو فارسی بھی دم توڑنے لگی۔ اردو نے کسی حد تک غیر محسوس انداز میں وادی میں قدم رکھے۔ باہر اردو کی دھوم تھی مگر یہاں ابھی فارسی کا ہی راج تھا۔

ڈوگرہ راج کے رنبیر سنگھ کا عہد (۱۸۵۶-۱۸۸۵ء) اردو کے لئے ایک خوش آئند دور رہا۔ اِسی زمانے میں اردو واحد تدریسی زبان بن گئی۔ اسکولوں میں اس ذریعۂ تعلیم کا درجہ بھی پایا۔ ایک طرف اُسے سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی، دوسری طرف عوام نے بھی اس کو گلے لگایا۔ گویا جموں و کشمیر قوم کو اپنے اظہار کا ایک بہتر ذریعہ ہاتھ آگیا۔ یہاں لکھے پڑھے لوگوں نے

اسی زبان میں اپنے مافی الضمیر کو پیش کرنے کی سعی کی ۔ یہاں اس زبان کا مطالعہ کافی بڑھا ۔ اس کے نتیجے میں مباحثے، ڈرامے اور دوسری ادبی سرگرمیاں عام ہو گئیں ۔ یہاں کی ہر انجمن، ہر ثقافتی مجلس اور ہر ادبی مجلس نے اُردو کا سہارا لیا اور یہ سلسلہ ابھی تک قائم و دائم ہے ۔ ان انجمنوں میں قابلِ ذکر یہ انجمنیں رہیں : (۱) حلقہ اربابِ ذوق، (۲) انجمن ترقی پسند مصنفین (۳) بزمِ خنداں ۔ اِن انجمنوں نے اردو کے مطالعے کے لئے مختلف سینٹر قائم کئے، اور ساتھ ہی ساتھ تخلیق و تنقید کے نئے شعبے بھی قائم کئے ۔ مشاعروں کا انعقاد کیا گیا، نت نئی شعری جہتیں وجود میں آئیں ۔ "شامِ افسانہ" منعقد کی گئی اور نئے نئے تخلیقی رویّوں کو افسانے کی دنیا میں داخل کیا گیا ۔ جن شاعروں اور ادیبوں نے آزادی سے پہلے کشمیر میں اُردو زبان و ادب میں تخلیقی وسعت پیدا کی، اُن میں پریم ناتھ پردیسی، دینا ناتھ نادمؔ، غلام رسول نازکیؔ، نند لال طالبؔ، پریم ناتھ دردؔ، شہ زور کشمیری، عبدالحق برقؔ، غ ۔ م طاؤس، قیصر قلندرؔ اور کومل نین پرواز وغیرہ چند قابلِ ذکر نام ہیں ۔ یہ سارے ادیب اور شاعر "حلقہ اربابِ ذوق" اور "ترقی پسند مصنفین" تنظیموں سے کسی نہ کسی طور وابستہ رہے ۔

شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ ساتھ اردو صحافیوں نے بھی اُردو زبان و ادب کے فروغ کے لئے بھرپور حصہ ادا کیا ۔ انھوں نے ۱۸۸۶ء (پہلے اردو اخبار "بدیا بلاس" کا سنِ اجراء) سے لے کر تا ایندم اپنے اخبارات سے اُردو زبان کو عوامی بنانے میں کافی نمایاں کام کیا ۔

"بدیا بلاس"، "شویا" [1]، "رنبیر" [2]، "چاند"، "ہدیا"، "پربھات" [3] ۔ اِن سب اخبارات نے اپنے مخصوص کالموں میں ادبی سرگرمیوں اور روداد کا ذکر بڑی شدّومد سے کیا اور اردو ادب کی تخلیقی وسعت میں ایک جاندار اضافہ کیا ۔ سرینگر کے اخبارات "مارتنڈ"، "وتستا"، "ہمدرد"، "آفتاب" اور "آئینہ" نے بھی اردو زبان و ادب



[illegible]

کو عام اور مقبول بنانے کے لئے ہر ممکن قدم اُٹھائے۔ وادی میں اردو شاعری کے ارتقا میں مشاعروں کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ان مشاعروں میں غیر منقسم ہندوستان سے اِس عہد کے اہم شعراء شرکت کرنے آتے تھے۔ ان مشاعروں ذکر سروری صاحب نے اپنی کتاب "کشمیر میں اردو" میں کیا ہے۔ ان مشاعروں میں مولانا شبلی، جگر مراد آبادی، فیض احمد فیض، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، ساغر نظامی، جگن ناتھ آزاد، وامق جونپوری، کمال احمد صدیقی اور سلام مچھلی شہری وغیرہ آتے تھے۔ وادی میں اُس وقت جو شعراء لیلائے اردو کو سنوار رہے تھے اُن میں نندلال طالب، شہہ زور کشمیری، غلام رسول نازکی اور شوریدہ کشمیری خاص طور پر یاد کئے جا سکتے ہیں۔ ان شاعروں نے ادبی رجحانات، دبستانوں اور اسکولوں سے شعری ردلیات لیں اور ان میں نئے نئے تجربات کئے۔ "ان کے تجربوں سے ہمیں عصری آگہی اور شعر و ادب میں تنقیدی بصارت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔"[1]

کشمیر میں غلام رسول نازکی نے "دیدۂ تر" اور نندلال کول طالب نے "رشحاتِ تخیل" لکھ کر اردو شعر و ادب میں نمایاں اضافہ کیا۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری کے افسانوی مجموعے "وادی کے پھول"، "برف میں آگ"، "سراب" اور "بہاروں میں شعلے"، "پگھلتے خواب"، "بلندیوں کے خواب" (ناول) اور "پرچھائیوں کا شہر (ناولٹ)، نور شاہ کے افسانوں کا مجموعہ "بے گھاٹ کی ناؤ"، "من کا آنگن" وغیرہ سے افسانوی ادب اور نئی شعری تکنیک میں قابلِ قدر اضافہ ہوا۔

آیئے! اب ذرا یہاں کے تخلیق کردہ تنقیدی ادب پر بھی نظر ڈالتے ہیں۔ اس سلسلے میں جو نام سب سے پہلے ہمارے سامنے آتے ہیں، وہ ہیں۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری، ڈاکٹر اکبر حیدری، محمد یوسف ٹینگ، ڈاکٹر ظہور الدین، ڈاکٹر برج پریمی اور پروفیسر نندلال طالب۔ ان حضرات نے نہ صرف تحقیق و تنقید میں نمایاں کام کیا، بلکہ ان کا کام اُردو زبان و ادب کے لئے ایک بیش بہا خزانہ

---

[1] جموں و کشمیر اُردو ادب نمبر۔ از منظر اعظمی۔

بن گیا۔ بقول ڈاکٹر برج پریمی:

"آزادی کے بعد اردو تحقیق اور تنقید نے کافی منزلیں طے کیں۔
۱۹۴۷ء کے بعد دراصل سائنسی عہد کا آغاز ہوتا ہے۔ ادب کا تجزیہ
بھی نفسیات، معاشیات اور سماجیات کی طرح سائنس کی روشنی
میں کیا جانے لگا۔ اس نئے ذہنی رویہ نے تنقید و تحقیق کے زاویے
بدل دیئے۔"[1]

تحقیق کے کارنامے، جدید نفسیات اور سماجی علوم کی مدد سے انجام پانے لگے۔
مغربی علم و فن کے مطالعے نے تحقیق اور اقتصادی شعور کو جلا بخشی، طرزِ بیان
اور اسالیب کی شگفتگی نے ادبی تحقیق اور تنقید کو ریاضی کے فارمولائی انداز
سے نکال کر سلاست اور شستگی عطا کی۔ انفرادی اور آزاد کارناموں کے ساتھ
ساتھ یونیورسٹیوں اور اکاڈمیوں کے توسط سے بھی اردو تحقیق و تنقید کو
سہارا ملا۔

آزادی کے بعد جو محقّق اور ناقد اُبھرے، اُن میں ڈاکٹر حامدی کاشمیری کا
نام سرفہرست ہے۔ اُن کی شخصیت ہمہ جہت ہے۔ انھوں نے شاعری، افسانے،
ناول اور تحقیق و تنقید وغیرہ اصناف پر اپنا قلم آزمایا۔ لیکن اِدھر چند برسوں
سے انھوں نے تحقیق اور تنقید کو ہی اپنا خاص موضوع بنالیا ہے۔ "جدید اردو
نظم اور یوروپی اثرات"۔ "غالب کے تخلیقی سرچشمے"۔ "نئی حسیّت اور عصری
اردو شاعری"۔ "کارگہہ شیشہ گری"۔ "غالب اور اقبال"۔ "ناصر کاظمی کی شاعری"
وغیرہ اس شعبے میں ان کے اہم کارنامے ہیں۔

محققین میں ڈاکٹر اکبر حیدری وہ اعلیٰ شخصیت ہے، جنھوں نے اردو کی
کلاسیکی شاعری پر بے تکان قلم چلایا ہے، انھوں نے اپنی محققانہ جگر کاوی سے
بے شمار نادر و نایاب تصنیفات کی دریافت کی ہے۔



[1] "جموں و کشمیر میں اردو تحقیق و تنقید"۔ از ڈاکٹر برج پریمی (بحوالہ۔ جموں و کشمیر اردو ادب نمبر)

حیدری صاحب نے بہت کچھ لکھا ہے۔ چنانچہ ان کی لکھی ہوئی کتابوں کی تعداد پچاس تک پہنچتی ہے۔ اِن کے علاوہ اِن کے مضامین (جو مختلف موضوعات پر ہوتے ہیں) ہند و پاک کے مؤقر اخبارات و رسائل اور جرائد میں شائع ہوتے ہیں۔ کلاسیکی شعراء، مراثی، قصائد، مثنویوں اور تذکروں پر اُن کا کام اُردو تحقیق و تنقید میں ایک منفرد اور اعلیٰ کام مانا جاتا ہے۔ میر۔ انیسؔ، دبیرؔ، شاد، میر حسن اور مصحفی پر اُن کا کام ایک سنگِ میل کی سی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر عزیز قریشی کا نام بھی اردو تحقیق و تنقید میں بڑے ادب سے لیا جاتا ہے۔ عزیز صاحب کا اگرچہ بُنیادی موضوع دینیات رہا ہے۔ پھر بھی ان کی تنقید میں جدید حسیت اور انگریزی زبان و ادب کی گہری واقفیت کا پتہ ملتا ہے۔ "جدید تنقیدی زاویے" اور "ہماری قومی اور انقلابی شاعری" ان کی ایسی کتابیں ہیں، جن سے شعر و ادب کے رموز سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ وہ ایک خاص ترتیب و تنظیم کے ساتھ اپنے خیالات کو پیش کرتے ہیں۔ جن سے اُن کی بالغ نظری اور وسعتِ علم کا بیّن ثبوت ملتا ہے۔

محمد زماں آزردہ کو بھی تحقیقی زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ دبیرؔ پر اُن کا کام ایک غیر جانبدار مطالعہ لگتا ہے۔ اُن کا یہ تحقیقی مقالہ، دبیرؔ کا ادبی مقام متعین کرنے کی ایک مستحسن کوشش ہے۔ ہند و پاک کے جرائد میں اُن کے بصیرت افروز تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں، جن ان کی بصیرت اور بصارت دونوں کا پتہ چلتا ہے۔

ڈاکٹر برج پریمی کشمیر کے محققین میں ایک معتبر اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ وہ اُردو فکشن پر گہری نظر رکھتے ہیں اور فکشن کے تمام اسرار و رموز سے نہ صرف واقف ہیں، بلکہ اس میں نئی جہتیں بھی پیدا کرتے ہیں۔ "حرفِ جستجو" اُن کے گہرے مطالعے اور نہایت کٹھن محنت کا نتیجہ ہے۔ اس سے ان کے ذہنی رویے کی نشان دہی ہوتی ہے اور بے لاگ تنقیدی بصیرت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اِن کے

مضامین تلاش و جستجو کی نہایت اعلیٰ کیفیتیں ہیں ۔ اُن میں بعض فن کاروں کے تخلیقی عمل اور اُن کے کام کے بعض اہم پہلوؤں پر تجزیاتی مطالعہ نظر آتا ہے ۔ اُن کے مضامین مُلک کے مقتدر جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں ۔ وہ نہایت چابکدستی، خلوص اور ادبی دیانتداری کے ساتھ تحقیقی اور تجزیاتی مطالعے کو پیش کرتے ہیں ۔ سعادت حسن منٹو پر ان کا تحقیقی اور تنقیدی مقالہ، منٹو کی حیات اور ان کے کارناموں کے تجزیاتی مطالعے پر اُردو میں اہم کتاب ہے ۔ برج پریمی کی خاص بات یہ ہے کہ وہ نہ تو روایات کے حصار میں بند رہتے ہیں اور نہ ہر صحیح یا غلط جدید ادبی رجحان یا رویّہ کو آسانی کے ساتھ قبول کرتے ہیں ۔ ادب و تہذیبی اقدار کے ردو قبول میں وہ خود اپنے تخلیقی شعور اور تنقیدی بصیرت پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں ۔

محمد یوسف ٹینگ کشمیر کے ایک ایسے نابغ نظر نقاد ہیں، جو نہ صرف اردو ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں، بلکہ کشمیری ادب پر بھی ان کی نگاہ بہت دور تک دیکھتی ہے ۔ غالبؔ، اقبالؔ، منٹوؔ اور کشمیری ادبا و شعرا پر اُن کے عالمانہ اور تحقیقی مقالے چھپ چکے ہیں ۔ مختلف کتابوں پر اُن کے مقدمے "مولوی عبدالحق" کو زندہ کرتے ہیں ۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع اور بصیرت افروز ہے ۔ شگفتہ اُسلوب اور منطقی استدلال سے ایک نئی سوچ و فکر کا احساس ہوتا ہے کشمیری، ڈوگری، لداخی اور اُردو پر اُن کی وسعتِ نظری عموماً دیکھنے کو ملتی ہے، وہ کشمیر کی تاریخ، لسانیاتی آہنگ اور تہذیبی و ثقافتی عروج و زوال کو پہچانتے ہیں اور اُن کے تانے بانے سے ہر سمت گہری واقفیت رکھتے ہیں ۔ وہ بیک وقت تاریخ داں، محقق، نقّاد اور صحافی ہیں ۔ ادب کلاسیکی ہو یا نفسیاتی، سائنسی ہو یا سماجیاتی، جدید ہو یا قدیم، وہ ہر ایک کی تاریخ اور ادوار سے گزرتے ہیں ۔ اور اپنی فکر سے استدلالانہ تحقیقی شعور کے خزانے منظرِ عام پر لاتے ہیں ۔ دفینوں کو کھنگھال کر دریافت کرنا اُن کی عادت ہے ۔

کشمیر کے دوسرے اہم نقادوں میں مرغوب بانہالی، رشید نازکی اور موتی لال ساقی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سب اُردو کے بڑے ایوانوں میں رسائی حاصل کر چکے ہیں۔ شعبۂ اُردو کشمیر یونیورسٹی کے اقبال انسٹی ٹیوٹ اور کلچرل اکاڈمی نے اردو شعر و ادب میں بیش بہا اضافے کئے ہیں۔ ان اداروں نے نہ صرف تحقیق و تنقید کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، بلکہ شاعری کو بھی صحت مند موڑ دیئے ہیں۔ شعبۂ اردو کے رسائل "باز یافت" "آگہی" اور "شعور"۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کے مجلّوں اور ریاستی کلچرل اکادمی کے مجلّے "شیرازہ" اور "ہمارا ادب" میں اعلیٰ معیار کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔

کشمیر میں اُردو زبان و ادب کے فروغ اور اردو تنقید و تحقیق کے ارتقاء کے باب میں پروفیسر شکیل الرحمٰن نے غیر معمولی کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ہر چند کہ پروفیسر شکیل الرحمٰن کشمیری الاصل نہیں، لیکن وادیٔ کشمیر کو انھوں نے اپنا وطن بنا لیا ہے اور کم و بیش گزشتہ تیس برسوں سے وہ اسی وادیٔ گل میں رہ کر اُردو تحقیق و تنقید کے سرمائے میں گرانقدر اضافہ کر رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اسوقت کشمیر میں جتنے بھی نئے محقق اور نقاد ہیں، ان میں سے اکثر و بیشتر کی تربیت ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے ہی کی ہے۔ آپ نے ایک بالغ نظر استاد کی حیثیت سے نِت نئے اہم موضوعات پر تحقیقی و تنقیدی مقالے تو لکھوائے ہی ہیں۔ اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو شکیل صاحب ہمیں ایسے ناقد نظر آئیں گے جو نہ صرف جمالیات کی روشنی میں فن اور فنکار کا تجزیہ کرتے ہوئے دکھائی دیں گے، بلکہ وہ نفسیات اور اساطیر کو بھی بنیادی اہمیت دیتے ہوئے سامنے آئیں گے۔ وہ تخلیق اور تخلیق کار کے باطن میں جھانکتے ہیں اور پھر دیانتدارانہ خلوص کے ساتھ اپنی آراء کا اظہار کرتے ہیں۔ شکیل صاحب مغربی ادب پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ اور مغربی ادب کے تمام رموز و اسرار سے واقف ہیں۔ وہ یونگ، اڈلر اور

ارک فرودم کی ذہنی کشاکش سے بھی لطف اُٹھاتے ہیں اور ہندوستانی جمالیات سے بھی من بہلاتے ہیں۔ جمالیات سے فیض حاصل کرنا اُن کا محبوب مشغلہ ہے۔ اُن کی تنقیدی بصیرت سے ہزاروں ادیب فائدہ اُٹھا چکے ہیں اور آج بھی وہ اُردو کی خدمت گزاری میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عصرِ حاضر کے نقادوں میں ایک منفرد اور اعلیٰ مقام پا چکے ہیں۔ غالب کی جمالیات، اقبال کا فلسفہ اور شکیل کی نزاکت و فیض کی کلاسیکیت پر انھوں نے سیر حاصل بحثیں کی ہیں اور اپنی شعر فہمی کا سکہ بٹھایا ہے، ان کی کتابوں کی ندرت، فکر و نظر کی وسعت، اعلیٰ تنقیدی بصیرت اور اُسلوب کی انفرادیت، اتنی اہم اور جاندار ہے کہ آنے والا زمانہ اُنھیں کبھی بھی "کل کی چیز" سمجھ کر نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

کشمیر کے مہمان ادیبوں میں پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم کی خدمات روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ وہ تحقیق کے شاہسوار اور تنقید کے سپہ سالار تھے۔ اُنھیں تحقیق سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ کشمیر میں اگرچہ انھوں نے صرف دس سال تک قیام کیا، مگر اس قلیل عرصے میں انھوں نے کشمیر کے تعلق سے گرانقدر کتابیں تصنیف کیں۔ "کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ"۔ "دو بھائی، دو ادیب"[1]۔ "تاریخ ادبیات کشمیر"[2] اور "کشمیر میں اُردو" کے عنوان سے معرکے کی کتابیں لکھ کر کشمیر کے تعلق سے ایک دستاویزی اہمیت کی حامل ادبی خدمات سر انجام دیں۔ یہ ساری کتابیں نہ صرف ضخیم ادبی سرمایہ ہیں، بلکہ تحقیق و تنقید کے پوشیدہ دفینوں کی بازیافت بھی ہیں۔ ہر کتاب اپنے موضوع اور کینواس کے لحاظ سے ندرت رکھتی ہے اور کشمیر کے چپے چپے کی ادبی تاریخ کا پتہ دیتی ہے۔

پروفیسر آلِ احمد سرور کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ اُردو ادب میں

---

[1] ڈوگرہ راج کے دو ادیبوں اور شاعروں کے حالاتِ زندگی۔
[2]۔ یہ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔

ایک مینارۂ نور ہیں، جن سے ہر ایک نیا ادیب و شاعر فیض حاصل کرتا ہے۔ اُنھوں نے اپنی ہمہ جہت نگرانی میں یہاں اقبال انسٹی ٹیوٹ قائم کیا اور اقبالیات کے غور و فکر کو عام کیا۔ ان کی تنقیدی بصیرت سے کشمیر کا ہر ادیب اور شاعر فیض یاب ہوا ہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد بھی کشمیر کے جہان ادیبوں اور شاعروں کے ہراول دستے میں نظر آتے ہیں۔ وہ کشمیر میں اپنی زندگی کا بہترین حصّہ گزار چکے ہیں۔ اُنہیں کشمیر کے حسن و جمال سے والہانہ محبّت ہے۔ وہ کشمیر کو اپنے محبوب اقبال کی نظر سے دیکھتے ہیں، اُنھوں نے اپنی سوچ، اپنی شاعری اور اپنے خیالات سے کشمیر اور کشمیر کے لوگوں سے بے انتہا پیار کیا ہے۔ وہ کشمیر کے سچے عاشق اور "اقبال کے وطن" کے شیدائی ہیں۔ ریاست میں اپنے قیام کے دوران، اُنھوں نے "اقبال اور کشمیر"، "اقبال اور مغربی مفکرین" اور "نشانِ منزل جیسی کتابیں لکھیں۔

آزاد صاحب، اقبال کے ایک عاشقِ صادق اور کشمیر میں اُردو ادب کے ایک پُرخلوص معمار ہیں۔ وہ اُردو کے ایک جلیل القدر شاعر تو ہیں ہی مگر تحقیق اور تنقید کے میدان کے شہسوار بھی ہیں۔ وہ "اقبال" کے کئی ایسے پہلوؤں کو بھی منظرِ عام پر لائے ہیں، جو گوشۂ تاریکی میں پڑے ہوئے تھے۔ وہ شعر فہمی اور شعر گوئی دونوں پر قدرت رکھتے ہیں۔ فلسفے کی باریکی اور جمالیاتی روشنی کی پرکھ کے خاص نبّاض ہیں۔ وہ نہایت خلوص اور ادبی دیانتداری کے ساتھ اپنی آراء کا اظہار کرتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی بے محل نہ ہوگی اگر میں اُن نقّادوں اور محقّقوں کا ذکر کروں، جو اس وادیٔ گُل پوش میں ہمارے درمیان بہت کم وقت گزار پائے۔ لیکن اُن کے قیمتی مقالات اور تحقیقی سرمائے سے کشمیر کے ادیب اور شاعر نہ صرف متاثر ہوئے ہیں، بلکہ اُن سے فیض بھی حاصل کیا ہے۔ اِن

نقادوں اور محققوں میں ڈاکٹر جعفر رضا، ڈاکٹر قدوس جاوید، ڈاکٹر کبیر جائسی، مظہر امام اور منظر اعظمی کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

اگرچہ تحقیق اور تنقید میں کشمیر کا حصہ بہت ہی کم رہا ہے۔ مگر معیار کے اعتبار سے بہت ہی اعلیٰ وارفع ہے۔ جس کو ادبیات کا کوئی بھی سنجیدہ قاری نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ہمارے کارنامے موضوع کے تنوّع کے اعتبار سے کسی بھی حالت میں کمتر درجہ نہیں رکھتے۔

اس کی وجہ، اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ ہم نے اردو کی دلہن کو ہر طرح اور بے انتہا سجانے کی کوشش کی ہے۔ کیوں کہ ہم اس کے ساتھ صدیوں سے والہانہ محبّت کرتے رہے ہیں۔

جموّں و کشمیر ہندوستان کی واحد ریاست ہے، جہاں اردو سرکاری زبان ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو تمام سرکاری دفاتر میں رائج نہیں اور بعض سیاسی وجوہ کی بنار پر اُردو کو "پورا" سرکاری مقام نہیں دیا جاتا۔ پھر بھی یہ بات باعثِ اطمینان ہے کہ یہاں کے اردو ادیبوں نے، اُردو کو الگ الگ خطّوں اور علاقوں کے درمیان پُل بنا دیا ہے۔ آج اردو ہی خیالات وجذبات کے باہمی اظہار کا واحد ذریعہ نظر آئی ہے۔ یہ بات بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اردو نثر کے لئے وادی ذرا بنجر رہی اور اردو شاعری نے یہاں کافی وسعت پائی۔ بقول مظہر امام :-

"ریاست میں جہاں تک اردو کا تعلّق ہے، نثر کے مقابلے میں شاعری کی طرف رجحان زیادہ ہے۔ یہ رجحان ریاست میں ہی نہیں، ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی ہے۔ لیکن یہاں یہ رجحان اس لئے نمایاں ہے کیوں کہ نثر کی طرف توجّہ دینے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔" [۱]

---

[۱] - جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نئی نسل کے امکانات۔ از مظہر امام (تعمیر، کا جموں و کشمیر ادب نمبر)

آیئے۔ اب ذرا اُن کی بات کریں، جنھوں نے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد دونوں زمانوں میں قدامت کو بھی دیکھا اور جدیدیت سے بھی آنکھیں ملائیں۔ ان شاعروں اور ادیبوں میں ڈاکٹر حامدی کاشمیری سرِ فہرست نظر آتے ہیں۔ حامدی ہی اُن ادیبوں میں وہ واحد ادیب ہیں، جنھوں نے عصری حسیت اور نئے مزاج کو سب سے پہلے قبول کیا۔ اُن کے بعد ہی ہمدم کاشمیری، حکیم منظور، مظفر ایرج وغیرہ کا نام آتا ہے۔

حامدی صاحب نے نہ صرف عصری مزاج اور نئی شاعری میں وسعتیں پیدا کیں، بلکہ اُنھوں نے نت نئے تجربوں سے ایک منفرد جگہ بھی بنالی۔ گذشتہ دو دہائی سے وہ لگاتار لکھ رہے ہیں اور اِن برسوں میں انھوں نے اپنی بصیرت اور بصارت سے ہزاروں چراغوں کو روشن کیا۔ انھوں نے اپنی شعری تخلیقات سے اردو ادب کو چمکایا اور اپنے تنقیدی مقالات سے اردو تحقیق و تنقید کے نئے باب کھولے ہیں۔

وقت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے جمود کے بادل چھٹنے لگے، کشمیر کے ادیبوں اور شاعروں نے، جن میں پرانی نسل کے کچھ ادیبوں کے علاوہ نئی نسل کے بہت سے لکھنے والے بھی شامل تھے۔ اُنھوں نے ریڈیو اور شعبۂ نشر و اشاعت اور کلچرل اکادمیوں کے علاوہ دوسرے ادبی مراکز بھی قائم کرنا شروع کئے۔ یہ صحیح ہے کہ اردو کی ترویج و ترقی میں ریڈیو کشمیر نے بھی ایک مثبت اور فعال کردار ادا کیا۔ یہاں ادیبوں کی "حوصلہ افزائی" کی گئی اور اُنھوں نے ادب کی تخلیق میں نئے نئے تجربے کرنے شروع کئے۔ ریڈیو کشمیر کی مدد سے جو ادیب اور شاعر یہاں آسمانِ اردو ادب پر چمکے۔ ان میں یہ نام قابلِ ذکر ہیں:۔ عبدالرحمن راہی، قیصر قلندر، فاروق نازکی، غلام رسول عارف، فاضل کشمیری، دینا ناتھ نادم، مکھن لعل بے کس، محور، ہردے کول بھارتی محمد علی لون، زتشی، اختر محی الدین، ستار احمد شاہد وغیرہ۔

ریڈیو کشمیر کے ساتھ ساتھ کلچرل اکادمی[1] نے بھی مالی معاونت سے یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کو اِس قابل بنایا کہ وہ صاحبِ کتاب ہو گئے۔ مالی امداد سے بہت سی اچھی اچھی کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ شعبۂ انفارمیشن نے بھی کئی رسائل[2] نکالے، جن کی وجہ سے اُردو زبان وادب کی ترقّی و ترویج کی راہ نکل آئی۔

محکمۂ انفارمیشن کے دوش بدوش محکمۂ اطلاعات و تعلّقاتِ عامہ نے بھی سرکار کی پالیسیوں کے فروغ کے لئے ادیبوں اور شاعروں کی خدمات حاصل کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ وادی کے کونے کونے میں ڈرامے اور تفریحی پروگرام منعقد کئے گئے۔ ان کوششوں سے پوری وادی میں اُردو کا ماحول تیار ہوا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ شاید ہی کوئی حصّہ ایسا ہو، جہاں اُردو کی کوئی نہ کوئی ادبی انجمن کام نہ کر رہی ہو۔ اُردو کی صورت کو بہتر بنانے کے لئے کشمیر یونیورسٹی کا شعبۂ اردو قابلِ ذکر اور قابلِ قدر کام انجام دے رہا ہے۔ چنانچہ اس شعبے نے اب تک ایک درجن سے زیادہ پی ایچ۔ ڈی اسکالرز تحقیقاتی مقالے مکمل کرائے ہیں۔ اور اس وقت بھی بارہ ۱۲ سے زیادہ اسکالر تحقیق کے کام پر لگے ہوئے ہیں۔ یونیورسٹی کے ادبی شعبے سے تقریباً دو رسالے ہر سال اجراء ہوتے ہیں[3]، جو بیرونِ ریاست بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

تدریسی ماحول میں اگرچہ اب بھی اردو کو مخصوص مسائل کا شکار ہونا پڑ رہا ہے، پھر بھی اُردو کی نیّا چلتی ہی نظر آتی ہے۔ آیئے! اب ذرا اُن

---

[1] - یہ اکادمی ۱۹۶۳ء میں وجود میں آئی۔

[2] - "تعمیر" "شیرازہ" وغیرہ۔

[3] - سابقہ سالوں میں یہ رسائل یہاں سے اجراء ہوئے۔ (۱) "نیا شعور" (۲) "عصری آگاہی"

باتوں پر بھی نظر ڈالتے ہیں، جنہوں نے یہاں اُردو کے خدوخال اُبھارے اور اُن کو استحکام بخشا۔

بقول نورشاہ:

"کچھ لوگ اب بھی ترقّی پسند ادب کو VULGARITY سے تعبیر کرنے سے نہیں ہچکچاتے ہیں۔ اب اس ادب کو ہنگامی، فروعی اور مصنوعی کہہ کر لتاڑا جاتا ہے۔ لیکن وادیٔ کشمیر میں ترقی پسند ادیبوں کے اس رول کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا جو انھوں نے یہاں ایک ادبی تحریک کو جنم دینے اور اردو کو ترقی دینے کے سلسلے میں ادا کیا۔ یہ اُن ہی ادیبوں اور شاعروں کا صدقہ ہے کہ آج ملک کے دوسرے حصّوں کے مقابلے میں ہماری ریاست میں اُردو اپنے آپ کو محفوظ پا رہی ہے۔ ہمارے آج کے ادیب اور شاعر جو اس وقت ملک بھر میں شہرت کے مالک ہیں، اِسی ادبی تحریک سے جنم پا چکے ہیں۔ آج جب کہ ترقی پسند تحریک کا کا زور ٹوٹ چکا ہے، لیکن کشمیر میں اس کے نام لیوا موجود ہیں۔ اور بڑی دلچسپی کے ساتھ اُردو زبان و ادب کی اشاعت و تشہیر کا کام کر رہے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، اِس ادبی کارواں میں نئے لکھنے والے شامل ہوئے اور اس وقت بھی اُردو کے تیئں اُن کی وفاداری اور خلوص پر شک نہیں کیا جا سکتا۔"[۱]

یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ء کے آخر یا ۱۹۴۸ء کے شروع میں اس تحریک سے اردو کافی فروغ ملا۔ نادمؔ، نور محمد روشنؔ، علی محمد لونؔ، اخترؔ، راہیؔ،

---

۱۔ "انتخابِ اُردو ادب" از نورشاہ۔ صہ۹

فراق اور سنتوش وغیرہ اسی تحریک کی دین ہیں۔ کلچرل فرنٹ نے ترقی پسند ادب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ فرنٹ دراصل ترقی پسندی کا ایک نیا جنم تھا۔ اس نے چند سالوں کام کیا اور بڑے بڑے کشمیری ادیبوں کو اُردو کی طرف راغب کیا۔ اس کے بعد کلچرل کانفرنس وجود میں آئی۔ اگرچہ اس کا مقصد یہ تھا کہ علاقائی زبانیں پھلیں پھولیں، مگر اس نے اُردو کے لیے بھی کافی راستہ ہموار کیا۔ ایک طرف کشمیری زبان وادب ترقی پانے لگا اور دوسری طرف اردو والوں نے بھی نئی تنظیموں اور انجمنوں کا سہارا لیا۔ ان تنظیموں اور انجمنوں کی کوششوں سے کلچرل اکادمی وجود میں آئی۔ جس نے اشاعت وطباعت میں یہاں انقلاب پیدا کیا۔

آزادی کے چند سالوں کے بعد کشمیر کے جو ادیب وشاعر اُردو کے مُلک گیر نقشے پر اُبھرے۔ اُن میں حامدیؔ[1]۔ شمیم احمد شمیمؔ، محمد یوسف ٹینگ" حکیم منظورؔ، برج پریمی، شہیدیؔ اور حیدریؔ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان سب نے اپنی لگن، محنت اور خلوص سے اردو کے پودے کو تناور درخت بنانے کی ہر ممکن کوشش کی اور نہ صرف اُردو کے نئے تقاضوں اور نئے مزاج کو گلے لگایا بلکہ اس میں خاطر خواہ اضافہ بھی کیا۔

۱۹۶۰ء کے آس پاس اُردو شعر وادب میں روایتی ادبی تصورات، موضوعات اور ہیئت ورویّہ کے خلاف احتجاج کے سائے اُبھرنے لگے اور پھر رفتہ رفتہ بعض انگریزی اور فرانسیسی مفکّروں اور ادیبوں کے اثر سے ایک خاص ادبی رجحان معرضِ وجود میں آیا۔ جسے اُردو میں جدیدیت کا رجحان کہتے ہیں۔ کشمیر کے ادیبوں اور شاعروں نے جدیدیت کے رجحان کو بھی اپنایا۔ خاص طور پر حامدی کاشمیری حکیم منظور، مظفر ایرج وغیرہ کی شاعری اسی دور میں پروان چڑھی۔

---

[1] ۔ حامدی کاشمیری

آیئے۔ اب اُن نگارشات پر بھی طائرانہ نگاہ ڈالتے ہیں، جن سے کشمیر میں اُردو زبان و ادب کی صورتِ حال تسلی بخش ہوئی اور جنہوں نے اپنے وجود سے باہر کے اردو طبقے میں بھی دادِ تحسین حاصل کی:-

| مصنف | تصنیف |
|---|---|
| (۱) پریم ناتھ پردیسی | "بہتے چراغ" (افسانوی مجموعہ) |
| (۲) نور شاہ | "من کا آنگن سونا سونا" "ایک رات کی ملکہ" "گیلے پتھروں کی مہک" |
| (۳) پریم ناتھ در | "نیلی آنکھیں" |
| (۴) پشکر ناتھ | "اندھیرے اُجالے" "دل کے باسی" "عشق کا چاند اندھیرا ہے" |
| (۵) علی محمد لون | "شاہد ہے تیری آرزو" |
| (۶) حامدی کاشمیری | "بلندیوں کا خواب" "لاحروف" |
| (۷) تیج بہادر | "سیلاب اور قطرے" |
| (۸) اکبر حیدری | "فطرت" (ناول) |
| (۹) حکیم منظور | "ناتمام" "لہولمس چنار" (شعری مجموعے) |
| (۱۰) حامدی کاشمیری | "نایافت" (شعری مجموعہ) |
| (۱۱) نند لال طالب | "رشحاتِ تخیل" (شعری مجموعہ) |
| (۱۲) قاضی غلام محمد | "حرفِ شیریں" (شعری مجموعہ) |
| (۱۳) غلام رسول نازکی | "دیدۂ تر" (شعری مجموعہ) |
| (۱۴) ڈاکٹر اے قدوس جاوید | "ادب اور سماجیات" (تنقیدی مضامین) |
| (۱۵) ڈاکٹر برج پریمی | "جلوۂ صد رنگ" ( " ) |
| (۱۶) پروفیسر شکیل الرحمٰن | "دستِ صبا" ( " ) |
| (۱۷) حامدی کاشمیری | "ناصر کاظمی کی شاعری" (تنقیدی جائزہ) |

(۱۸) ڈاکٹر شمس الدین احمد "رسول اللہؐ"

(۱۹) پروفیسر سرور "تنقید کیا ہے؟"

(۲۰) ڈاکٹر برج پریمی "حرفِ جستجو"

(۲۱) رشید تاثیر "تحریکِ حریت کشمیر (۳-جلدیں)"

(۲۲) حامدی کاشمیری "کارگہِ شیشہ گری" ۔ وغیرہ .....

ان کے علاوہ یہاں کے جن ادیبوں اور شاعروں نے قابلِ ذکر کتابیں لکھی ہیں وہ ہیں ۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، ڈاکٹر شمس الدین، فاضل کشمیری، قیصر قلندر، اکبر جے پوری، ڈاکٹر برج پریمی، کلدیپ رعنا، شبنم قیوم، رشید تاثیر ڈاکٹر صوفی غلام محی الدین، ڈاکٹر قدوس جاوید، ڈاکٹر محمد زماں آزردہ، شمس الدین شمیم، وحشی، سید ساحل اور عمر مجید۔

ان ساری باتوں اور کام کو دیکھ کر اس بات کا اطمینان ہو جاتا ہے کہ کشمیر میں اُردو شعر و ادب کی صورتِ حال اگرچہ زیادہ اچھی نہیں ہے، لیکن حوصلہ شکن بھی نہیں۔ بقول اقبال ؒ ع

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

# جموّں وکشمیر میں
# اُردو زبان وادب کی صورتِ حال

اُردو کشمیر میں فارسی کے بعد آئی اور فارسی سے پہلے یہاں سنسکرت کا راج تھا۔ ہر زبان نے اپنے اثرات چھوڑے اور ہر اثر نیا جامہ پہن کر چمکنے اور دمکنے لگا۔ تاثر اور تخلیق میں چونکہ چولی دامن کا داسطہ ہوتا ہے اس لئے زبان وادب بھی کے سہارے چلتے ہیں۔ تاثر کچھ کرنے کے لئے اکساتا ہے اور تخلیق جنم لیتی ہے۔ کشمیر میں سنسکرت کا تاثر فارسی پر رہا اور فارسی نے اُردو پر اپنے تاثر کو برقرار رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر میں فارسی تخلیقات پر سنسکرت کا خاطر خواہ اثر نظر آتا ہے۔ شہمیری خاندان (۱۵۸۶-۱۳۳۹ء) رخصت ہوا تو فارسی بھی دم توڑنے لگی۔ اردو نے کسی حد تک غیر محسوس انداز میں وادی میں قدم رکھے۔ باہر اردو کی دھوم تھی مگر یہاں ابھی فارسی کا ہی راج تھا۔

ڈوگرہ راج کے رنبیر سنگھ کا عہد (۱۸۸۵-۱۸۵۶ء) اردو کے لئے ایک خوش آئند دور رہا۔ اِسی زمانے میں اردو واحد تدریسی زبان بن گئی۔ اسکولوں میں اس ذریعۂ تعلیم کا درجہ بھی پایا۔ ایک طرف اُسے سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی، دوسری طرف عوام نے بھی اس کو گلے لگایا۔ گویا جمود زدہ قوم کو اپنے اظہار کا ایک بہترین ذریعہ ہاتھ آگیا۔ یہاں کے پڑھے لکھے لوگوں نے

اسی زبان میں اپنے مافی الضمیر کو پیش کرنے کی سعی کی ۔ یہاں اس زبان کا مطالعہ کافی بڑھا ۔ اس کے نتیجے میں مباحثے، ڈرامے اور دوسری ادبی سرگرمیاں عام ہو گئیں ۔ یہاں کی ہر انجمن، ہر ثقافتی مجلس اور ہر ادبی مجلس نے اُردو کا سہارا لیا اور یہ سلسلہ ابھی تک قائم و دائم ہے ۔ ان انجمنوں میں قابلِ ذکر یہ انجمنیں رہیں: (۱) حلقہ اربابِ ذوق، (۲) انجمن ترقی پسند مصنفین (۳) بزمِ خنداں ۔ اِن انجمنوں نے اردو کے مطالعے کے لئے مختلف سینٹر قائم کئے، اور ساتھ ہی ساتھ تخلیق و تنقید کے نئے شعبے بھی قائم کئے ۔ مشاعروں کا انعقاد کیا گیا، نت نئی شعری جہتیں وجود میں آئیں ۔ "شامِ افسانہ" منعقد کی گئی اور نئے نئے تخلیقی رویوں کو افسانے کی دنیا میں داخل کیا گیا ۔ جن شاعروں اور ادیبوں نے آزادی سے پہلے کشمیر میں اُردو زبان و ادب میں تخلیقی وسعت پیدا کی، اُن میں پریم ناتھ پردیسی، دینا ناتھ نادم، غلام رسول نازکی، نند لال طالب، پریم ناتھ درد، شہ زور کشمیری، عبدالحق برق، غ ۔ م طاؤس، قیصر قلندر اور کومل نین پرواز وغیرہ چند قابلِ ذکر نام ہیں ۔ یہ سارے ادیب اور شاعر "حلقہ اربابِ ذوق" اور "ترقی پسند مصنفین" تنظیموں سے کسی نہ کسی طور وابستہ رہے ۔

شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ ساتھ اردو صحافیوں نے بھی اُردو زبان و ادب کے فروغ کے لئے بھرپور حصہ ادا کیا ۔ انھوں نے ۱۸۸۶ء (پہلے اردو اخبار "بدیا بلاس" کا سنِ اجراء) سے لے کر تا ایندم اپنے اخبارات سے اُردو زبان کو عوامی بنانے میں کافی نمایاں کام کیا ۔

"بدیا بلاس" "ہمدیا" [1] "رنبیر" [2] "چاند" "ہریا" "پربھات" [3] ۔ اِن سب اخبارات نے اپنے مخصوص کالموں میں ادبی سرگرمیوں اور روداد کا ذکر بڑی شد و مد سے کیا اور اردو ادب کی تخلیقی وسعت میں ایک جاندار اضافہ کیا ۔ سرینگر کے اخبارات "مارتنڈ"، "وتستا"، "ہمدرد"، "آفتاب" اور "آئینہ" نے بھی اردو زبان و ادب



[1] وادی کا پہلا اخبار [2] آزاد صحافت کا پہلا نمونہ [3] پونچھ کا اخبار

کو عام اور مقبول بنانے کے لئے ہر ممکن قدم اُٹھائے ۔ وادی میں اردو شاعری کے ارتقا میں مشاعروں کا بڑا ہاتھ رہا ہے ۔ ان مشاعروں میں غیر منقسم ہندوستان سے اِس عہد کے اہم شعراء شرکت کرنے آتے تھے ۔ ان مشاعروں ذکر سروری صاحب نے اپنی کتاب "کشمیر میں اردو" میں کیا ہے ۔ ان مشاعروں میں مولانا شبلیؔ، جگرؔ مراد آبادی، فیض احمد فیضؔ، جوشؔ ملیح آبادی، فراقؔ گورکھپوری، ساغرؔ نظامی، جگن ناتھ آزادؔ، وامقؔ جونپوری، کمال احمد صدیقی اور سلام مچھلی شہری وغیرہ آتے تھے ۔ وادی میں اُس وقت جو شعراء لیلائے اردو کو سنوار رہے تھے اُن میں نندلال طالبؔ، شہزورؔ کشمیری، غلام رسول نازکیؔ اور شوریدہ کشمیری خاص طور پر یاد کئے جا سکتے ہیں ۔ ان شاعروں نے ادبی رجحانات، دبستانوں اور اسکولوں سے شعری روایات لیں اور ان میں نئے نئے تجربات کئے ۔ " ان کے تجربوں سے ہمیں عصری آگہی اور شعر و ادب میں تنقیدی بصارت کا بھی اندازہ ہوتا ہے ۔ "[۱]

کشمیر میں غلام رسول نازکی نے "دیدۂ تر" اور نندلال کول طالب نے "رشحاتِ تخیل" لکھ کر اردو شعر و ادب میں نمایاں اضافہ کیا ۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری کے افسانوی مجموعے "وادی کے پھول"، "برف میں آگ"، "سراب" اور "بہاروں میں شعلے"، "پگھلتے خواب"، "بلندیوں کے خواب" (ناول) اور "پرچھائیوں کا شہر" (ناولٹ)، نور شاہ کے افسانوں کا مجموعہ "بے گھاٹ کی ناؤ"، "من کا آنگن" وغیرہ سے افسانوی ادب اور نئی شعری تکنیک میں قابلِ قدر اضافہ ہوا ۔

آئیے ! اب ذرا یہاں کے تخلیق کردہ تنقیدی ادب پر بھی نظر ڈالتے ہیں ۔ اس سلسلے میں جو نام سب سے پہلے ہمارے سامنے آتے ہیں، وہ ہیں ۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری، ڈاکٹر اکبر حیدری، محمد یوسف ٹینگ، ڈاکٹر ظہور الدین، ڈاکٹر برج پریمی اور پروفیسر نندلال طالب ۔ ان حضرات نے نہ صرف تحقیق و تنقید میں نمایاں کام کیا، بلکہ ان کا کام اُردو زبان و ادب کے لئے ایک بیش بہا خزانہ

---

[۱] جموں و کشمیر اُردو ادب نمبر ۔ از منظر اعظمی ۔

بن گیا۔ بقول ڈاکٹر برج پریمی:

"آزادی کے بعد اُردو تحقیق اور تنقید نے کافی منزلیں طے کیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد دراصل سائنسی عہد کا آغاز ہوتا ہے۔ ادب کا تجزیہ بھی نفسیات، معاشیات اور سماجیات کی طرح سائنس کی روشنی میں کیا جانے لگا۔ اس نئے ذہنی رویّہ نے تنقید و تحقیق کے زاویے بدل دیئے۔"[1]

تحقیق کے کارنامے، جدید نفسیات اور سماجی علوم کی مدد سے انجام پانے لگے۔ مغربی علم و فن کے مطالعے نے تحقیق اور اقتصادی شعور کو جِلا بخشی، طرزِ بیان اور اسالیب کی شگفتگی نے ادبی تحقیق اور تنقید کو ریاضی کے فارمولائی انداز سے نکال کر سلاست اور شستگی عطا کی۔ انفرادی اور آزاد کارناموں کے ساتھ ساتھ یونیورسٹیوں اور اکاڈمیوں کے توسط سے بھی اردو تحقیق و تنقید کو سہارا ملا۔

آزادی کے بعد جو محقّق اور ناقد اُبھرے، اُن میں ڈاکٹر حامدی کاشمیری کا نام سرِفہرست ہے۔ اُن کی شخصیت ہمہ جہت ہے۔ انھوں نے شاعری، افسانے، ناول اور تحقیق و تنقید وغیرہ اصناف پر اپنا قلم آزمایا۔ لیکن اِدھر چند برسوں سے انھوں نے تحقیق اور تنقید کو ہی اپنا خاص موضوع بنا لیا ہے۔ "جدید اُردو نظم اور یورپی اثرات"۔ "غالب کے تخلیقی سرچشمے"۔ "نئی حسیّت اور عصری اردو شاعری"۔ "کارگہہ شیشہ گری"۔ "غالب اور اقبال"۔ "ناصر کاظمی کی شاعری" وغیرہ اس شعبے میں ان کے اہم کارنامے ہیں۔

محققین میں ڈاکٹر اکبر حیدری وہ اعلیٰ شخصیت ہے، جنھوں نے اردو کی کلاسیکی شاعری پر بے تکان قلم چلایا ہے، انھوں نے اپنی محققانہ جگر کاوی سے بے شمار نادر و نایاب تصنیفات کی دریافت کی ہے۔



[1] "جموں و کشمیر میں اردو تحقیق و تنقید"۔ از ڈاکٹر برج پریمی (بحوالہ جموں و کشمیر اردو ادب نمبر")

حیدری صاحب نے بہت کچھ لکھا ہے۔ چنانچہ ان کی لکھی ہوئی کتابوں کی تعداد پچاس تک پہنچتی ہے۔ اِن کے علاوہ اِن کے مضامین (جو مختلف موضوعات پر ہوتے ہیں) ہند و پاک کے مُوقر اخبارات و رسائل اور جرائد میں شائع ہوتے ہیں۔ کلاسیکی شعراء، مراثی، قصائد، مثنویوں اور تذکروں پر اُن کا کام اُردو تحقیق و تنقید میں ایک منفرد اور اعلیٰ کام مانا جاتا ہے۔ میرؔ۔ انیسؔ، دبیرؔ، شاد، میر حسن اور مصحفی پر اُن کا کام ایک سنگِ میل کی سی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر عزیز قریشی کا نام بھی اردو تحقیق و تنقید میں بڑے ادب سے لیا جاتا ہے۔ عزیز صاحب کا اگرچہ بُنیادی موضوع دینیات رہا ہے۔ پھر بھی ان کی تنقید میں جدید حسیت اور انگریزی زبان و ادب کی گہری واقفیت کا پتہ ملتا ہے۔ "جدید تنقیدی زادیے" اور "ہماری قومی اور انقلابی شاعری" ان کی ایسی کتابیں ہیں، جن سے شعر و ادب کے رموز سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ وہ ایک خاص ترتیب و تنظیم کے ساتھ اپنے خیالات کو پیش کرتے ہیں۔ جن سے اُن کی بالغ نظری اور وسعتِ علم کا بیّن ثبوت ملتا ہے۔

محمد زماں آزردہ کو بھی تحقیقی زُمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ دبیرؔ پر اُن کا کام ایک غیر جانبدار مطالعہ لگتا ہے۔ اُن کا یہ تحقیقی مقالہ، دبیرؔ کا ادبی مقام متعیّن کرنے کی ایک مستحسن کوشش ہے۔ ہند و پاک کے جرائد میں اُن کے بصیرت افروز تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں، جن ان کی بصیرت اور بصارت دونوں کا پتہ چلتا ہے۔

ڈاکٹر برج پریمی کشمیر کے محققین میں ایک معتبر اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ وہ اُردو فکشن پر گہری نظر رکھتے ہیں اور فکشن کے تمام اسرار و رموز سے نہ صرف واقف ہیں، بلکہ اس میں نئی جہتیں بھی پیدا کرتے ہیں۔ "حرفِ جستجو" اُن کے گہرے مطالعے اور نہایت کٹھن محنت کا نتیجہ ہے۔ اس سے ان کے ذہنی رویّے کی نشاندہی ہوتی ہے اور بے لاگ تنقیدی بصیرت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اِن کے

مضامین تلاش وجستجو کی نہایت اعلیٰ کیفیتیں ہیں۔ اُن میں بعض فن کاروں کے تخلیقی عمل اور اُن کے کام کے بعض اہم پہلوؤں پر تجزیاتی مطالعہ نظر آتا ہے۔ اُن کے مضامین مُلک کے مقتدر جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وہ نہایت چابکدستی، خلوص اور ادبی دیانتداری کے ساتھ تحقیقی اور تجزیاتی مطالعے کو پیش کرتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو پران کا تحقیقی اور تنقیدی مقالہ، منٹو کی حیات اور ان کے کارناموں کے تجزیاتی مطالعے پر اُردو میں اہم کتاب ہے۔ برج پریمی کی خاص بات یہ ہے کہ وہ نہ تو روایات کے حصار میں بند رہتے ہیں اور نہ ہر صحیح یا غلط جدید ادبی رجحان یا رویّہ کو آسانی کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ ادب و تہذیبی اقدار کے ردو قبول میں وہ خود اپنے تخلیقی شعور اور تنقیدی بصیرت پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں۔

محمد یوسف ٹینگ کشمیر کے ایک ایسے نابغ نظر نقاد ہیں، جو نہ صرف اردو ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں، بلکہ کشمیری ادب پر بھی ان کی نگاہ بہت دور تک دیکھتی ہے۔ غالبؔ، اقبالؔ، منٹوؔ اور کشمیری ادبار و شعرار پر اُن کے عالمانہ اور تحقیقی مقالے چھپ چکے ہیں۔ مختلف کتابوں پر اُن کے مقدمے "مولوی عبدالحق" کو زندہ کرتے ہیں۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع اور بصیرت افروز ہے۔ شگفتہ اُسلوب اور منطقی استدلال سے ایک نئی سوچ و فکر کا احساس ہوتا ہے کشمیری، ڈوگری، لداخی اور اُردو پر اُن کی وسعتِ نظری عموماً دیکھنے کو ملتی ہے، وہ کشمیر کی تاریخ، لسانیاتی آہنگ اور تہذیبی و ثقافتی عروج و زوال کو پہچانتے ہیں اور اُن کے تانے بانے سے ہر سمت گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ بریک وقت تاریخ داں، محقق، نقّاد اور صحافی ہیں۔ ادب کلاسیکی ہو یا نفسیاتی، سائنسی ہو یا سماجیاتی، جدید ہو یا قدیم، وہ ہر ایک کی تاریخ اور ادوار سے گزرتے ہیں۔ اور اپنی فکر سے استدلالانہ تحقیقی شعور کے خزانے منظرِ عام پر لاتے ہیں۔ دفینوں کو کھنگھال کر دریافت کرنا اُن کی عادت ہے۔

کشمیر کے دوسرے اہم نقادوں میں مرغوب بانہالی، رشید نازکی اور موتی لال ساقی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سب اُردو کے بڑے ایوانوں میں رسائی حاصل کر چکے ہیں۔ شعبۂ اُردو کشمیر یونیورسٹی کے اقبال انسٹی ٹیوٹ اور کلچرل اکاڈمی نے اردو شعروادب میں بیش بہا اضافے کئے ہیں۔ ان اداروں نے نہ صرف تحقیق و تنقید کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، بلکہ شاعری کو بھی صحت مند موڑ دیئے ہیں۔ شعبۂ اردو کے رسائل "بازیافت" "آگہی" اور "شعور"۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کے مجلوں اور ریاستی کلچرل اکادمی کے مجلّے "شیرازہ" اور "ہمارا ادب" میں اعلیٰ معیار کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔

کشمیر میں اُردو زبان وادب کے فروغ اور اردو تنقید و تحقیق کے ارتقاء کے باب میں پروفیسر شکیل الرحمٰن نے غیر معمولی کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ہر چند کہ پروفیسر شکیل الرحمٰن کشمیری الاصل نہیں، لیکن وادیٔ کشمیر کو انھوں نے اپنا وطن بنالیا ہے اور کم و بیش گزشتہ تیس برسوں سے وہ اسی وادیٔ گل میں رہ کر اُردو تحقیق و تنقید کے سرمائے میں گرانقدر اضافہ کر رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اسوقت کشمیر میں جتنے بھی نئے محقق اور نقاد ہیں، ان میں سے اکثر و بیشتر کی تربیت ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے ہی کی ہے۔ آپ نے ایک بالغ نظر استاد کی حیثیت سے نِت نئے اہم موضوعات پر تحقیقی و تنقیدی مقالے تو لکھوائے ہی ہیں۔ اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو شکیل صاحب ہمیں ایسے ناقد نظر آئیں گے جو نہ صرف جمالیات کی روشنی میں فن اور فنکار کا تجزیہ کرتے ہوئے دکھائی دیں گے، بلکہ وہ نفسیات اور اساطیر کو بھی بنیادی اہمیت دیتے ہوئے سامنے آئیں گے۔ وہ تخلیق اور تخلیق کار کے باطن میں جھانکتے ہیں اور پھر دیانتدارانہ خلوص کے ساتھ اپنی آراء کا اظہار کرتے ہیں۔ شکیل صاحب مغربی ادب پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ اور مغربی ادب کے تمام رموز واسرار سے واقف ہیں۔ وہ یونگ، اڈلر اور

ارک فروم کی ذہنی کشاکش سے بھی لطف اُٹھاتے ہیں اور ہندوستانی جمالیات سے بھی من بہلاتے ہیں۔ جمالیات سے فیض حاصل کرنا اُن کا محبوب مشغلہ ہے۔ اُن کی تنقیدی بصیرت سے ہزاروں ادیب فائدہ اُٹھا چکے ہیں اور آج بھی وہ اُردو کی خدمت گزاری میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عصرِ حاضر کے نقادوں میں ایک منفرد اور اعلیٰ مقام پا چکے ہیں۔ غالب کی جمالیات، اقبال کا فلسفہ اور شکیل کی نزاکت و فیض کی کلاسیکیت پر انھوں نے سیر حاصل بحثیں کی ہیں اور اپنی شعر فہمی کا سکہ بٹھایا ہے، ان کی کتابوں کی ندرت، فکر و نظر کی وسعت، اعلیٰ تنقیدی بصیرت اور اُسلوب کی انفرادیت، اتنی اہم اور جاندار ہے کہ آنے والا زمانہ اُنھیں کبھی بھی "کل کی چیز" سمجھ کر نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

کشمیر کے مہمان ادیبوں میں پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم کی خدمات روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔ وہ تحقیق کے شاہسوار اور تنقید کے سپہ سالار تھے۔ اُنھیں تحقیق سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ کشمیر میں اگرچہ انھوں نے صرف دس سال تک قیام کیا، مگر اس قلیل عرصے میں انھوں نے کشمیر کے تعلق سے گرانقدر کتابیں تصنیف کیں۔ "کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ"۔ "دو بھائی، دو ادیب"[1]۔ "تاریخ ادبیات کشمیر"[2] اور "کشمیر میں اُردو" کے عنوان سے معرکے کی کتابیں لکھ کر کشمیر کے تعلق سے ایک دستاویزی اہمیت کی حامل ادبی خدمات سرانجام دیں۔ یہ ساری کتابیں نہ صرف ضخیم ادبی سرمایہ ہیں، بلکہ تحقیق و تنقید کے پوشیدہ دفینوں کی بازیافت بھی ہیں۔ ہر کتاب اپنے موضوع اور کینوا اس کے لحاظ سے ندرت رکھتی ہے اور کشمیر کے چپے چپے کی ادبی تاریخ کا پتہ دیتی ہے۔

پروفیسر آلِ احمد سرور کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ اُردو ادب میں

---

[1] ڈوگرہ راج کے دو ادیبوں اور شاعروں کے حالاتِ زندگی۔
[2] یہ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔

ایک مینارۂ نور ہیں، جن سے ہر ایک نیا ادیب و شاعر فیض حاصل کرتا ہے۔ اُنھوں نے اپنی ہمہ جہت نگرانی میں یہاں اقبال انسٹی ٹیوٹ قائم کیا اور اقبالیات کے غور و فکر کو عام کیا۔ ان کی تنقیدی بصیرت سے کشمیر کا ہر ادیب اور شاعر فیض یاب ہوا ہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد بھی کشمیر کے جہان ادیبوں اور شاعروں کے ہراول دستے میں نظر آتے ہیں۔ وہ کشمیر میں اپنی زندگی کا بہترین حصّہ گزار چکے ہیں۔ اُنھیں کشمیر کے حسن و جمال سے والہانہ محبّت ہے۔ وہ کشمیر کو اپنے محبوب اقبال کی نظر سے دیکھتے ہیں، اُنھوں نے اپنی سوچ، اپنی شاعری اور اپنے خیالات سے کشمیر اور کشمیر کے لوگوں سے بے انتہا پیار کیا ہے۔ وہ کشمیر کے سچے عاشق اور "اقبال کے وطن" کے شیدائی ہیں۔ ریاست میں اپنے قیام کے دوران، اُنھوں نے "اقبال اور کشمیر"، "اقبال اور مغربی مفکرین" اور "نشانِ منزل جیسی کتابیں لکھیں۔

آزاد صاحب، اقبال کے ایک عاشقِ صادق اور کشمیر میں اُردو ادب کے ایک پُرخلوص معمار ہیں۔ وہ اُردو کے ایک جلیل القدر شاعر تو ہیں ہی مگر تحقیق اور تنقید کے میدان کے شہسوار بھی ہیں۔ وہ "اقبال" کے کئی ایسے پہلوؤں کو بھی منظرِ عام پر لائے ہیں، جو گوشۂ تاریکی میں پڑے ہوئے تھے۔ وہ شعر فہمی اور شعر گوئی دونوں پر قدرت رکھتے ہیں۔ فلسفے کی باریکی اور جمالیاتی روشنی کی پرکھ کے خاص نبّاض ہیں۔ وہ نہایت خلوص اور ادبی دیانتداری کے ساتھ اپنی آراء کا اظہار کرتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی بے محل نہ ہوگی اگر میں اُن نقّادوں اور محققوں کا ذکر کروں، جو اس وادیٔ گل پوش میں ہمارے درمیان بہت کم وقت گزار پائے۔ لیکن اُن کے قیمتی مقالات اور تحقیقی سرمائے سے کشمیر کے ادیب اور شاعر نہ صرف متاثر ہوئے ہیں، بلکہ اُن سے فیض بھی حاصل کیا ہے۔ ان

نقادوں اور محققوں میں ڈاکٹر جعفر رضا، ڈاکٹر قدوس جاوید، ڈاکٹر کبیر جائسی، مظہر امام اور منظر اعظمی کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

اگرچہ تحقیق اور تنقید میں کشمیر کا حصہ بہت ہی کم رہا ہے۔ مگر معیار کے اعتبار سے بہت ہی اعلیٰ وارفع ہے۔ جس کو ادبیات کا کوئی بھی سنجیدہ قاری نظر انداز نہیں کرسکتا۔ ہمارے کارنامے موضوع کے تنوّع کے اعتبار سے کسی بھی حالت میں کم تر درجہ نہیں رکھتے۔

اس کی وجہ، اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ ہم نے اردو کی دلہن کو ہر طرح اور بے انتہا سجانے کی کوشش کی ہے۔ کیوں کہ ہم اس کے ساتھ صدیوں سے والہانہ محبت کرتے رہے ہیں۔

جموں و کشمیر ہندوستان کی واحد ریاست ہے، جہاں اردو سرکاری زبان ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو تمام سرکاری دفاتر میں رائج نہیں اور بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر اُردو کو "پورا" سرکاری مقام نہیں دیا جاتا۔ پھر بھی یہ بات باعثِ اطمینان ہے کہ یہاں کے اردو ادیبوں نے، اُردو کو الگ الگ خطّوں اور علاقوں کے درمیان پُل بنا دیا ہے۔ آج اردو ہی خیالات و جذبات کے باہمی اظہار کا واحد ذریعہ نظر آتی ہے۔ یہ بات بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اردو نثر کے لئے وادی ذرا بنجر رہی اور اردو شاعری نے یہاں کافی وسعت پائی۔ بقول مظہر امام:-

"ریاست میں جہاں تک اردو کا تعلق ہے، نثر کے مقابلے میں شاعری کی طرف رجحان زیادہ ہے۔ یہ رجحان ریاست میں ہی نہیں، ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی ہے۔ لیکن یہاں یہ رجحان اس لئے نمایاں ہے کیوں کہ نثر کی طرف توجہ دینے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔"[1]

---

[1] - جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نئی نسل کے امکانات۔ از مظہر امام (تعمیر کا جموں و کشمیر ادب نمبر)

آیئے۔ اب ذرا اُن کی بات کریں، جنھوں نے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد دونوں زمانوں میں قدامت کو بھی دیکھا اور جدیدیت سے بھی آنکھیں ملائیں۔ ان شاعروں اور ادیبوں میں ڈاکٹر حامدی کاشمیری سر فہرست نظر آتے ہیں۔ حامدی ہی اُن ادیبوں میں وہ واحد ادیب ہیں، جنہوں نے عصری حسیت اور نئے مزاج کو سب سے پہلے قبول کیا۔ اُن کے بعد ہی ہمدم کاشمیری، حکیم منظور، مظفر ایرج وغیرہ کا نام آتا ہے۔

حامدی صاحب نے نہ صرف عصری مزاج اور نئی شاعری میں وسعتیں پیدا کیں، بلکہ اُنھوں نے نت نئے تجربوں سے ایک منفرد جگہ بھی بنالی۔ گذشتہ دو دہائی سے وہ لگاتار لکھ رہے ہیں اور ان برسوں میں انہوں نے اپنی بصیرت اور بصارت سے ہزاروں چراغوں کو روشن کیا۔ انھوں نے اپنی شعری تخلیقات سے اردو ادب کو جگمگایا اور اپنے تنقیدی مقالات سے اردو تحقیق و تنقید کے نئے باب کھولے ہیں۔

وقت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے جمود کے بادل چھٹنے لگے، کشمیر کے ادیبوں اور شاعروں نے، جن میں پرانی نسل کے کچھ ادیبوں کے علاوہ نئی نسل کے بہت سے لکھنے والے بھی شامل تھے۔ اُنھوں نے ریڈیو اور شعبۂ نشر و اشاعت اور کلچرل اکادمیوں کے علاوہ دوسرے ادبی مراکز بھی قائم کرنا شروع کئے۔ یہ صحیح ہے کہ اردو کی ترویج و ترقی میں ریڈیو کشمیر نے بھی ایک مثبت اور فعال کردار ادا کیا۔ یہاں ادیبوں کی "حوصلہ افزائی" کی گئی اور اُنھوں نے ادب کی تخلیق میں نئے نئے تجربے کرنے شروع کئے۔ ریڈیو کشمیر کی مدد سے جو ادیب اور شاعر یہاں آسمانِ اردو ادب پر چمکے۔ ان میں یہ نام قابلِ ذکر ہیں :۔ عبدالرحمٰن راہی، قیصر قلندر، فاروق نازکی، غلام رسول عارف، فاضل کشمیری، دینا ناتھ نادم، مکھن لعل بےکس، محور، ہردے کول بھارتی محمد علی لون، زتشی، اختر محی الدین، ستار احمد شاہد وغیرہ۔

ریڈیو کشمیر کے ساتھ ساتھ کلچرل اکادمی[1] نے بھی مالی معاونت سے یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کو اس قابل بنایا کہ وہ صاحبِ کتاب ہو گئے۔ مالی امداد سے بہت سی اچھی اچھی کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ شعبۂ انفارمیشن نے بھی کئی رسائل[2] نکالے، جن کی وجہ سے اُردو زبان وادب کی ترقّی و ترویج کی راہ نکل آئی۔

محکمۂ انفارمیشن کے دوش بدوش محکمۂ اطلاعات و تعلّقات عامہ نے بھی سرکار کی پالیسیوں کے فروغ کے لئے ادیبوں اور شاعروں کی خدمات حاصل کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ وادی کے کونے کونے میں ڈرامے اور تفریحی پروگرام منعقد کئے گئے۔ ان کوششوں سے پوری وادی میں اُردو کا ماحول تیار ہوا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ شاید ہی کوئی حصہ ایسا ہو، جہاں اُردو کی کوئی نہ کوئی ادبی انجمن کام نہ کر رہی ہو۔ اُردو کی صورت کو بہتر بنانے کے لئے کشمیر یونیورسٹی کا شعبۂ اردو قابلِ ذکر اور قابل قدر کام انجام دے رہا ہے۔ چنانچہ اس شعبے نے اب تک ایک درجن سے زیادہ پی۔ایچ۔ڈی اسکالرز تحقیقاتی مقالے مکمل کرائے ہیں۔ اور اس وقت بھی بارہ[12] سے زیادہ اسکالر تحقیق کے کام پر لگے ہوئے ہیں۔ یونیورسٹی کے ادبی شعبے سے تقریباً دو رسالے ہر سال اجراء ہوتے ہیں، جو بیرونِ ریاست بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

تدریسی ماحول میں اگرچہ اب بھی اردو کو مخصوص مسائل کا شکار ہونا پڑ رہا ہے، پھر بھی اُردو کی نیّا چلتی ہی نظر آتی ہے۔ آیئے! اب ذرا اُن

---

[1]۔ یہ اکادمی ۱۹۶۳ء میں وجود میں آئی۔

[2]۔ "تعمیر" "شیرازہ" وغیرہ۔

[3]۔ سابقہ سالوں میں یہ رسائل یہاں سے اجراء ہوئے۔ (۱) نیا شعور" (۲) "عصری آگاہی"

باتوں پر کبھی نظر ڈالتے ہیں، جنہوں نے یہاں اُردو کے خدوخال اُبھارے اور اُن کو استحکام بخشا۔

بقول نور شاہ:

"کچھ لوگ اب بھی ترقّی پسند ادب کو VULGARITY سے تعبیر کرنے سے نہیں ہچکچاتے ہیں۔ اب اس ادب کو ہنگامی، فروعی اور مصنوعی کہہ کر لتاڑا جاتا ہے۔ لیکن وادیٔ کشمیر میں ترقی پسند ادیبوں کے اس رول کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا جو انھوں نے یہاں ایک ادبی تحریک کو جنم دینے اور اردو کو ترقی دینے کے سلسلے میں ادا کیا۔ یہ اُن ہی ادیبوں اور شاعروں کا صدقہ ہے کہ آج ملک کے دوسرے حصّوں کے مقابلے میں ہماری ریاست میں اُردو اپنے آپ کو محفوظ پا رہی ہے۔ ہمارے آج کے ادیب اور شاعر جو اس وقت ملک بھر میں شہرت کے مالک ہیں، اِسی ادبی تحریک سے جنم پا چکے ہیں۔ آج جب کہ ترقی پسند تحریک کا کا زور ٹوٹ چکا ہے، لیکن کشمیر میں اس کے نام لیوا موجود ہیں۔ اور بڑی دل چسپی کے ساتھ اُردو زبان و ادب کی اشاعت و تشہیر کا کام کر رہے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، اِس ادبی کارواں میں نئے لکھنے والے شامل ہوئے اور اس وقت بھی اُردو کے تیئں اُن کی وفاداری اور خلوص پر شک نہیں کیا جا سکتا۔"[1]

یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ء کے آخر یا ۱۹۴۸ء کے شروع میں اس تحریک سے اردو کافی فروغ ملا۔ نادم، نور محمد روشن، علی محمد لون، اختر، راہی،

---

۱۔ "انتخابِ اُردو ادب" از نور شاہ صفحہ ۶

فراق اور سنتوش وغیرہ اسی تحریک کی دین ہیں۔ کلچرل فرنٹ نے ترقی پسند ادب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ فرنٹ دراصل ترقی پسندی کا ایک نیا جنم تھا۔ اس نے چند سالوں کام کیا اور بڑے بڑے کشمیری ادیبوں کو اُردو کی طرف راغب کیا۔ اس کے بعد کلچرل کانفرنس وجود میں آئی۔ اگرچہ اس کا مقصد یہ تھا کہ علاقائی زبانیں پھلیں پھولیں، مگر اس نے اُردو کے لیے بھی کافی راستہ ہموار کیا۔ ایک طرف کشمیری زبان و ادب ترقی پانے لگا اور دوسری طرف اردو والوں نے بھی نئی تنظیموں اور انجمنوں کا سہارا لیا۔ ان تنظیموں اور انجمنوں کی کوششوں سے کلچرل اکادمی وجود میں آئی۔ جس نے اشاعت و طباعت میں یہاں انقلاب پیدا کیا۔

آزادی کے چند سالوں کے بعد کشمیر کے جو ادیب و شاعر اُردو کے مُلک گیر نقشے پر اُبھرے۔ اُن میں حامدی[1]۔ شمیم احمد شمیم، محمد یوسف ٹینگ "حکیم منظور، برج پریمی، شہیدی اور حیدری وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان سب نے اپنی لگن، محنت اور خلوص سے اردو کے پودے کو تناور درخت بنانے کی ہر ممکن کوشش کی اور نہ صرف اُردو کے نئے تقاضوں اور نئے مزاج کو گلے لگایا بلکہ اس میں خاطر خواہ اضافہ بھی کیا۔

سنہ ۱۹۶۰ء کے آس پاس اُردو شعر و ادب میں روایتی ادبی تصورات، موضوعات اور ہیئت و رویّہ کے خلاف احتجاج کے سائے اُبھرنے لگے اور پھر رفتہ رفتہ بعض انگریزی اور فرانسیسی مفکروں اور ادیبوں کے اثر سے ایک خاص ادبی رجحان معرض وجود میں آیا۔ جسے اُردو میں جدیدیت کا رجحان کہتے ہیں۔ کشمیر کے ادیبوں اور شاعروں نے جدیدیت کے رجحان کو بھی اپنایا۔ خاص طور پر حامدی کاشمیری حکیم منظور، مظفر ایرج وغیرہ کی شاعری اسی دور میں پروان چڑھی۔

---

[1] - حامدی کاشمیری

آیئے۔ اب اُن نگارشات پر بھی طائرانہ نگاہ ڈالتے ہیں، جن سے کشمیر میں اُردو زبان و ادب کی صورتِ حال تسلی بخش ہوئی اور جنہوں نے اپنے وجود سے باہر کے اردو طبقے میں بھی دادِ تحسین حاصل کی :-

| مصنف | تصنیف |
|---|---|
| (۱) پریم ناتھ پردیسی | "بہتے چراغ" (افسانوی مجموعہ) |
| (۲) نور شاہ | "من کا آنگن سُونا سُونا"، "ایک رات کی ملکہ"، "گیلے پتھروں کی مہک"، "نیلی آنکھیں" |
| (۳) پریم ناتھ در | "اندھیرے اُجالے"، "دل کے باسی" |
| (۴) پشکر ناتھ | "عشق کا چاند اندھیرا ہے" |
| (۵) علی محمد لون | "شاہد ہے تیری آرزو" |
| (۶) حامدی کاشمیری | "بلندیوں کا خواب"، "لاحروف" |
| (۷) تیج بہادر | "سیلاب اور قطرے" |
| (۸) اکبر حیدری | "فطرت" (ناول) |
| (۹) حکیم منظور | "ناتمام"، "لہو لمس چنار" (شعری مجموعے) |
| (۱۰) حامدی کاشمیری | "نایافت" (شعری مجموعہ) |
| (۱۱) نند لال طالب | "رشحاتِ تخیل" (شعری مجموعہ) |
| (۱۲) قاضی غلام محمد | "حرفِ شیریں" (شعری مجموعہ) |
| (۱۳) غلام رسول نازکی | "دیدۂ تر" (شعری مجموعہ) |
| (۱۴) ڈاکٹر اے فردوس جاوید | "ادب اور سماجیات" (تنقیدی مضامین) |
| (۱۵) ڈاکٹر برج پریمی | "جلوۂ صد رنگ" ( " ) |
| (۱۶) پروفیسر شکیل الرحمٰن | "دستِ صبا" ( " ) |
| (۱۷) حامدی کاشمیری | "ناصر کاظمی کی شاعری" (تنقیدی جائزہ) |

(۱۸) ڈاکٹر شمس الدین احمد "رسول اللہؐ"

(۱۹) پروفیسر سرور "تنقید کیا ہے؟"

(۲۰) ڈاکٹر برج پریمی "حرفِ جستجو"

(۲۱) رشید تاثیر "تحریکِ حریتِ کشمیر (۳-جلدیں)"

(۲۲) حامدی کاشمیری "کارگہِ شیشہ گری"۔ وغیرہ .....

ان کے علاوہ یہاں کے جن ادیبوں اور شاعروں نے قابلِ ذکر کتابیں لکھی ہیں وہ ہیں۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، ڈاکٹر شمس الدین، فاضل کشمیری قیصر قلندر، اکبر جے پوری، ڈاکٹر برج پریمی، کلدیپ رعنا، شبنم قیوم، رشید تاثیر ڈاکٹر صوفی غلام محی الدین، ڈاکٹر قدوس جاوید، ڈاکٹر محمد زماں آزردہ، شمس الدین شمیم، وحشی، سید ساحل اور عمر مجید۔

ان ساری باتوں اور کام کو دیکھ کر اس بات کا اطمینان ہو جاتا ہے کہ کشمیر میں اُردو شعر و ادب کی صورتِ حال اگرچہ زیادہ اچھی نہیں ہے، لیکن حوصلہ شکن بھی نہیں۔ بقول اقبال ؒ ع

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

# باب ششم
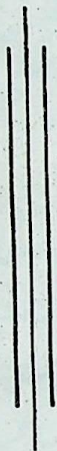
## کشمیر کے نمائندہ شعراء

# کشمیر کے چند نمائندہ شعراء

سنہ ۱۹۴۷ء ہماری تمدّنی، معاشی، سیاسی اور سماجی زندگی کے لئے ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی سال ہمارا ملک غلامی کے چنگل سے نکل کر آزادی کی سانسیں لینے لگا۔ زندگی کو نئے سرے سے ترتیب دینے اور آزادی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ہر سمت سے بڑے پیمانے پر تحریک چل پڑی۔ تمدّنی سطح پر سارے ملک میں ایک خوشگوار فضا قائم ہوئی اور مقامی REGIONAL بولیوں اور زبانوں کو فروغ دیا جانے لگا۔ بہت سی زبانوں کو قانونی درجہ دیا گیا۔ ان زبانوں میں اُردو بھی شامل ہے۔ لیکن چند وجوہ کی بناء پر اس کے لئے کوئی علاقہ متعین نہیں کیا جا سکا، اس طرح اس زبان کی ترقی و ترویج کی راہیں بہت حد تک مسدود ہو گئیں۔ ڈوگرہ دور (۱۸۸۹ء) میں اردو ریاست کی تدریسی زبان بنی اور اسکولوں میں اسے ذریعۂ تعلیم کی حیثیت حاصل ہوئی۔ سرکاری سرپرستی کے ساتھ عوام نے بھی اس سے بھرپور تعاون کیا اور یہ واحد ایسی زبان بن گئی جس میں عام پڑھے لکھے لوگ اپنا مافی الضمیر پیش کرتے تھے۔ اُردو شاعری اور ادب کے فروغ کے لئے کئی تنظیمیں وجود میں آئیں۔ جن میں "حلقۂ

اربابِ ذوق" (۱۹۴۳ء یا ۱۹۴۴ء) "انجمن ترقی پسند مصنفین" ۱۹۴۶ء اور "کلچرل فرنٹ" ۱۹۴۷ء اہم ہیں۔

۱۹۴۷ء سے پہلے جن شاعروں اور ادیبوں نے اپنے آپ کو اُردو داں طبقوں اور ایوانوں تک پہنچایا، وہ اپنے مافی الضمیر کو اردو میں ہی پیش کرتے تھے۔ غلام رسول نازکی، پروفیسر نندلال طالب، قیصر قلندر، پریم ناتھ در، پریم ناتھ پردیسی، راماننند ساگر، کنول نین پرواز، شہزور کاشمیری، غ۔ م طاؤس، عبدالحق برق اور کئی ایسے نام ہیں جو اُردو ایوانوں میں مقبول ہو چکے تھے۔ یہ سب ادیب اور شاعر "حلقہ اربابِ ذوق" اور "ترقی پسند مصنفین" کے ساتھ وابستہ رہے۔ انھوں نے اُردو کی ترویج و ترقی میں ہر تحریک کے ذریعے ایک فعال کردار ادا کیا۔ اس طرح اُردو آزادی سے پہلے اور اس کے بعد ایک مسلمہ ادبی اور فنی زبان کی حیثیت سے اُبھری۔ کچھ لوگ ترقی پسند ادب کو VULGARITY کا نام دے کر اس ادب کو مصنوعی یا فروعی گردانتے ہیں۔ مگر یہ بات مسلمہ ہے کہ ترقی پسند تحریک نے ہی یہاں اُردو کو ترقی کی معراج تک پہنچایا۔ ہمارے آج کے ادیب اور شاعر جو اس وقت مُلک بھر میں مقبول ہیں، اسی تحریک کے پروردہ ہیں۔ آج بھی یہاں اس تحریک کے جاں نثار موجود ہیں، جو اردو کے تئیں اپنی وفاداری اور خلوص برقرار رکھے ہوئے ہیں اُن کی نیت پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۹۶۰ء تک ترقی پسند تحریک کا زور قائم رہا۔ پھر ملک گیر پیمانے پر جدیدیت کی تحریک نے شعروادب کو ہلا کر رکھ دیا اور جدیدیت کا رجحان کم و بیش پورے اردو ادب پر چھا گیا۔ ظاہر ہے ریاست جموں و کشمیر کے ادیب اور شعرا اس سے متاثر ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہاں جدید شاعروں اور افسانہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد سامنے آگئی۔ اور ان میں سے چند ایک اُردو شعروادب کے اہم افراد مانے جاتے ہیں۔

اس دوران کچھ کہنہ مشق قلمکار بھی اس تحریک میں شامل ہوئے اور کچھ بالکل نئے لکھنے والوں کے نام بھی اُبھرے۔ ان میں خاص طور پر قابلِ ذکر صادق علی اسیر

ہردے کول بھارتی، فاروق نازکی، ابرج، منظور، فرحت اور نور شاہ ہیں۔
شاعری میں عصری آگہی، تجریدی شاعری، ابہام پسندی، جنسی اور نفسیاتی
موضوعات کا بے باکانہ اظہار ہوا۔ نثری نظم، آزاد غزل جیسی کئی نئی اصناف
پر طبع آزمائیاں کی گئیں۔ جدید شاعری کے نام پر ۱۹۶۰ء کے بعد کشمیر میں جو
شعری سرمایہ سامنے آیا۔ وہ یہاں کے چند نمائندہ شاعروں کی شعری تخلیقات
کا نتیجہ ہے۔ اِس باب میں ہم نے کشمیر کے جن نمائندہ اردو شاعروں کو پیش
کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں خاص طور سے غلام رسول نازکی، نند لال
طالب، شوریدہ کاشمیری، شہہ زور کاشمیری، حامدی کاشمیری، حکیم منظور اور
مظفر ایرج وغیرہ اہم ہیں۔ نئی نسل کے چند نمائندہ شاعروں کے کلام کا بھی
اس مقالے میں جائزہ لیا گیا ہے۔ مثلاً رفیق راز، رخسانہ جبیں، قیوم ہمدم،
ہمراز، واجدہ تبسم، مسعود سامون اور عابدہ احمد وغیرہ۔ ان کے کلام کا بھی
اختصاراً جائزہ لے کر تجزیہ کیا جائے گا، اس امید کے ساتھ کہ اس سے کشمیر
کی ساری (نئی اور پرانی) اردو شاعری کا خاکہ ذہن میں اُبھرے گا۔

# غلام رسول نازکی

آپ ۱۶ر مارچ سنہ ۱۹۱۰ء میں بمقام بانڈی پورہ کشمیر میں پیدا ہوئے۔
ابتدائی تعلیم مکتبہ میں پائی۔ پھر بی اے کی ڈگری آنرز کے ساتھ حاصل کی۔
سنہ ۱۹۲۷ء میں عائشہ بانو نام کی ایک خاندانی لڑکی سے شادی کی، سنہ ۱۹۲۶ء میں آٹھ
روپے ماہانہ تنخواہ پر ریاستی محکمۂ تعلیم میں بحیثیت مدرس وارد ہوئے۔ سنہ ۱۹۴۶ء
میں ریڈیو کشمیر کے بانیوں میں وہ شامل تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ریاستی
حکومت کے ہفتہ وار کے ایڈیٹر رہے۔ بانڈی پورہ راس نہ آیا تو شہر سرینگر کے
کاٹھی دروازے میں سکونت پذیر ہوئے اور اس وقت بھی وہیں رہتے ہیں۔
نازکی کی ذات ریاست جموں وکشمیر کے اُردو دانوں کے لئے ایک مشہور و
معروف ذات ہے۔ انھوں نے تقریباً ہر اُردو تحریک کو بہت قریب سے دیکھا
اور برتا ہے۔ سنہ ۱۹۴۷ء سے پہلے ان کی شاعری کا رنگ روایتی کلاسیکی تھا۔ لیکن
صحیح معنوں میں ان کی شاعری کسی بھی مخصوص رجحان یا تحریک سے بالاتر ہے۔
ان کی ابتدائی شاعری عشق کے سوز و گداز سے پُر ہے، اُن کی درمیانی شاعری
مقصدیت کے گرد گھومتی ہے اور آج جب کہ وہ عمر کی اس حد تک پہنچ چکے ہیں،
جس کو عرفِ عام میں بڑھاپا کہتے ہیں تو ان کی شاعری میں روایت پسندی،
مقصدیت اور جدت پسندی کے عناصر شیر وشکر ہو کر ایک امتزاجی رنگ و آہنگ کا

پتہ دیتے ہیں جو اچھی اور قابلِ قدر شاعری کی ضمانت ہے۔

راقم الحروف کے ساتھ ایک ملاقات میں انھوں نے اس طرح اپنی ادبی زندگی کے آغاز کا ذکر کیا:

"میری ادبی زندگی کا آغاز سِنِ شعور سے ہوا۔ کیونکہ گھر کا ماحول ادبی تھا اور والد بزرگوار فارسی اور عربی کے جید عالم تھے، اسکول میں داخلے سے پہلے ہی میں نے عربی اور فارسی میں کافی مہارت حاصل کر لی تھی اور ادبی ذوق بھی پیدا ہو گیا تھا۔ اردو شاعری کی طرف طبیعت تب مائل ہوئی جب مجھے محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" پڑھنے کا موقع ملا۔ سن تھا ۱۹۲۶ء۔"

اس سوال کے جواب میں کہ آپ زیادہ تر کس صنفِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا:

"اردو غزل اور قطعات لکھتا ہوں، کچھ نظمیں بھی لکھی ہیں، مگر بہت کم۔ نظم کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی۔"

"جس وقت آپ نے شاعری شروع کی، اُس وقت کشمیر میں یا کشمیر سے باہر اُردو شاعری کا کیا حال تھا۔؟ راقم نے اس سوال کا انھوں نے یوں جواب دیا۔

"جس وقت میں نے شاعری شروع کی اس وقت کشمیر میں اردو شاعری کا آغاز ہی ہوا تھا، یہاں مشکل سے چند آدمی اُردو لکھتے تھے۔ باہر کے رسالے (لاہور، حیدرآباد، دہلی یا بمبئی کے) یہاں کے اردو ادیبوں کی نگارشات نظرانداز ہی کرتے تھے، اس سلسلے میں میں ایک Anecdate واقعہ آپ کو بتاؤں۔ میں نے "ادبِ لطیف" اور لاہور کے کئی دیگر رسالوں کو اپنی نگارشات بھیجیں، جہاں وہ اکثر ردی کی ٹوکری کی نذر ہو گئیں۔ انھوں نے مجھے چار سال تک نظرانداز کیا، مگر میں نے ہمت نہ ہاری۔ ایک نظم "معصوم لڑکی" جوش ملیح آبادی کے زیرِ ادارت نکلنے والے رسالے کو

بھوپال بھیجی۔ اُس رسالے کا نام "کلیم" تھا۔ انھوں نے خلاف توقع اسے من وعن دوسرے صفحہ پر شائع کیا۔ لطف یہ تھا کہ پورا دوسرا صفحہ جلی حروف میں میری نظم سے بھر گیا تھا اور ستم ظریفی یہ تھی کہ جن رسائل نے مجھے چار سال تک مسلسل نظر انداز کیا تھا۔ انہوں نے اس رسالے ("کلیم") سے پوری کی پوری نظم نقل کی اور اپنے اخبار میں اُس رسالے کا شکریہ ادا کیا۔ اس طرح یقین محکم، عملِ پیہم اور محبت کو فاتح عالم جانتے ہوئے میں نے اپنا ادبی سفر جاری رکھا۔ جس وقت میں نے یہاں (کشمیر میں) لکھنا شروع کیا تھا اُن دنوں یہاں قیس شیروانی، دشوانا تھ در ماں، نند لال طالب اور شہزور کاشمیری قابلِ ذکر لکھنے والے تھے۔ کشمیر سے باہر پنجاب میں اُردو کی حکمرانی تھی۔"

اُردو شاعری کے اہم رجحانات اور خاص طور پر ترقی پسندی اور جدیدیت کے رجحان کا آپ کی شاعری پر کیا اثر پڑا۔؟ اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ:۔

" ترقی پسندی اور جدیدیت کا مجھ پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ میں کلاسیکی ادب کا عاشق ہوں۔!"

میرے اس سوال کے جواب میں کہ آپ کے خیال میں کشمیر میں اردو شاعری کی شروعات کب ہوئی اور کس نے اس کی ابتدا کی۔؟ جناب غلام رسول نازکی نے فرمایا:۔

" مجھے اندازہ نہیں کہ کشمیر میں اردو شاعری کب شروع ہوئی۔ مگر جس زمانہ میں یہاں چودھری خوشی محمد خاں ناظر گورنر اور ریونیو منسٹر تھے، اُردو شاعری کا چرچا ہوا۔ ایک تحصیلدار ملک قمر اردو کے اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے اور ریزیڈنسی کے بڑے منشی خانصاحب منشی سراج الدین بڑے ادب نواز تھے، اُن ہی کی توجہ سے یہاں اُردو شاعری پھلنے پھولنے لگی۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں ایک کل ہند مشاعرہ ان ہی کوششوں سے ایس۔ پی کالج ہال میں ہوا۔ جس کی صدارت سر تیج بہادر سپرو نے کی تھی۔ میں بھی

اِس مشاعرے میں شریک ہوا تھا۔"

اپنے شعری مجموعے کے متعلق آپ نے فرمایا :-

"میرا ایک شعری مجموعہ "دیدۂ تر" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اب اس کی کوئی کاپی نہیں ملتی۔ اس کو میں نے خود ہی طبع کرایا تھا۔ اس کا پیش لفظ میرے عزیز دوست جناب غلام محمد طاؤس نے لکھا تھا۔ یہ میرے ایک مرحوم بچّے کے نام منسوب ہے۔ قیمت یاد نہیں کیا تھی۔ کتابت محمد امین قاضی ڈی۔ سی سرینگر کے والد صاحب نے کی تھی۔ یہ مجموعہ غالباً ۲۰۰ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس میں غزلیں، نظمیں اور قطعات وغیرہ شامل ہیں۔"

اس سوال کے جواب میں کہ "آپ کا کلام ریاست میں یا ریاست سے باہر کن کن رسائل یا اخباروں میں چھپ چکا ہے؟" انھوں نے فرمایا :-

"میرا کلام ۱۹۴۷ء سے پہلے لاہور کے ادبی رسالوں خاص کر "ادبی دنیا" "ادب لطیف"۔ "شاہکار" اور "ہمایوں" میں شائع ہوتا تھا۔ بھوپال سے "کلیم" نامی ایک اعلیٰ درجہ کا رسالہ جوش ملیح آبادی نکال رہے تھے۔ اُس میں میرا کلام نمایاں طور پر شائع ہوتا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد میں زیادہ تر "آج کل" (دہلی) اور "شیرازہ" (سری نگر) میں کبھی کبھا لکھتا رہا۔"

نازکی صاحب پچھلے تیس پینتیس سالوں سے شعر و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں، انہیں ہند و پاک کے سخنوروں میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج انھیں کسی بھی طرح کے خیالات کے فنکارانہ اظہار پر قدرت حاصل ہے چنانچہ اُنہیں اپنی اردو دانی اور شعر گوئی پر ناز ہے، خود اس فخر کو طنطنے سے بیان کرتے ہیں

کشمیر کا رہنے والا ہوں، اُردوئے مُعلّیٰ لکھتا ہوں
اس دیس میں مجھ سا کوئی بھی اردو کا سخنور ہو نہ سکا

انھیں بچپن سے شعر و شاعری اور موسیقی سے لگاؤ رہا۔ خاندان بھی ایسا ملا جہاں اُن کا شوق نہایت آب و تاب کے ساتھ پروان چڑھا۔ بڑے بڑے سخنوروں سے

ملاقات ہوئی اور وہ اُن کی تربیت سے سخن سنج بن گئے۔ عروض، زبان کے نکات، محاورہ اور شعری اسالیب پر عبور حاصل ہوا۔ فنی نکات پر قدرت حاصل ہوئی۔ لیکن انہوں نے فن کے بل پر شعر نہیں کہے، بلکہ ان کا فطری ذوق انہیں شعر کہنے کے لئے اُکساتا رہا۔ نازکی کی فارسی دانی، شاعری کی اعلیٰ قدروں کا عرفان، شاعری کے امکانات اور منصب کا شدید احساس، زندگی اور زمانے کا تجربہ اور تخلیقِ فن کی بے پناہ مشق کے سبب ان کی غزلوں کی طرح ان کی رباعیاں اور قطعات بھی بیحد معیاری ہیں، بلکہ کئی اعتبار سے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نازکی کی پہچان ان کی غزلوں کے ساتھ ہی اُن کی رباعیاں اور قطعات کی وجہ سے بھی ہوتی ہے۔

اُن کا تخلیقی شعور کبھی بھی جامد نہیں رہا۔ بلکہ ہر دور میں نشو ونما پاتا رہا۔ وہ حُسن و عشق کے بھی غوطہ زن رہے اور ازلی و ابدی حیات کی آویزش کو بھی سمجھا۔ لیکن سستے تغزل سے اُن کا ذہن ہمیشہ بھاگتا رہا۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کی غزل محض ہیئت کے اعتبار سے غزل ہے، ورنہ دَور کی تہذیبی، سماجی اور اخلاقی قدریں اس میں زیادہ نظر آتی ہیں۔ حُسن و عشق کی بدلتی ہوئی شکلوں میں انسانی فطرت کو زیادہ گہرائی سے سمجھنے اور ہر جذبے کو عقلیت کی دار پر چڑھانے میں نازکی کو لُطف آتا ہے۔

قدیم اساتذہ کی پیروی کرنا اور فکر و فن اور نظریات کی توسیع کرنا نازکی ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی غزل میں کائنات کے تمام حُسن کو، اپنے محبوب کے وسیلے سے دیکھتے ہیں۔ اس مشینی دور میں والہانہ اور عاشقانہ سپردگی اور خلوص و محبوبیت پر ایمان لائے بغیر ایسے شعر نہیں کہے جا سکتے، جن میں غزل کی تمام روایتی طرح داریاں اور جدید عشوے ہوں۔ وہ حسن و عشق کے معاملات و کیفیات اور محبوب کے سراپے کی طرح زندگی کے دوسرے مسائل بھی اپنے ساغرِ فن میں سموتے ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اشعار کا تناسب تیزی سے بدلتا نظر آتا ہے۔ بڑے بڑے اساتذہ کو سامنے رکھ کر استفادہ کرنا، صحت مند تنقیدی شعور کے

ساتھ اپنی انفرادیت کی تشکیل، اپنے عہد کی سوگواری اور اداسی کو اپنی شخصیت کے وسیلے سے پیش کرنا، غم انگیز اور غم خیز ماحول میں زلیست کرنا اور شعور زبان کا ارتقائی جدید تصوّر رکھنا نازکی کی ایک ایسی "بھاری صفت" ہے۔ جس نے اُن کے کلام کو پختگی، آسودگی اور شگفتگی عطا کی۔

کبھی وہ میرؔ کی افسردگی اور یاس سے گزرتے ہیں اور کبھی اقبالؔ کا ناصحانہ انداز اپناتے ہیں، کبھی غالبؔ کی خودداری ان کے کلام سے ہویدا ہوتی ہے اور کبھی وہ آتشؔ کی طرح "خالص" عاشق دکھائی دیتے ہیں۔ اقبالؔ کے رنگ کی ایک غزل کے دو اشعار ملاحظہ ہوں۔

یہ ظہورِ نورِ سحر نہیں یہ فروغِ شمس و قمر نہیں
شبِ غم اُچھل کے سمٹ گئی خم و پیچ زلفِ دراز میں

نہ سرور میرے رکوع میں ہے نہ حضور میرے سجود میں
نہ نظام میرے قیام میں نہ گداز میری نماز میں

" نازکی صاحب ابتدا میں اخبار "ہمدرد" اور دوسرے اخباروں میں اپنا کلام غنیؔ کاشمیری کے قلمی نام سے شائع کراتے تھے[1]" پھر انھوں نے ۱۹۴۸ء تک اتنا کلام جمع کیا کہ ایک مجموعہ "دیدۂ تر" کی صورت میں ہمارے سامنے آگیا۔ یہ مجموعہ ۱۹۴۹ء میں نازکی کے ایک دوست غلام محمد طاؤسؔ کے تعارف کے ساتھ شائع ہوا۔ طاؤسؔ جو خود بھی ایک اچھے نقاد اور شاعر ہیں۔ وہ نازکی کی شاعرانہ خوبیاں اسطرح بیان کرتے ہیں۔ "آپ کی شاعری ایک دُکھی دل کی پکار ہے، ایک غم انگیز پکار۔ آپ کے یہاں غم، زندگی کی اہم ترین حقیقت سے عبارت ہے۔ نازکی کا شعر ہے ؎

محبت زندگی اور زندگی غم ہوتی جاتی ہے
خوشی تحلیل ہو کر غم میں مدغم ہوتی جاتی ہے

نازکی کے احساسِ غم کا فانیؔ کی لذّتِ الم سے مقابلہ کرتے ہوئے دوسری جگہ

---

[1] "کشمیر میں اردو" حصہ سوئم۔ از ڈاکٹر عبدالقادر سروری۔ صہ ۳۸۵

طاؤس صاحب یوں رقمطراز ہیں:

"غم کا یہ خوشگوار تصوّر جس کو اُردو شاعری میں فانیؔ نے مستقل موضوع کے طور پر روشناس کیا، قنوطیت اور یاسیت کے اس قدیم تصوّر سے بالکل جُداگانہ ہے۔ یہ غم انسان کو فرار پر مجبور نہیں کرتا اور نہ بے عملی کی طرف مائل کرتا ہے۔ نازکیؔ کے یہاں غم کا یہ تصوّر اس حد تک کارفرما ہے کہ آپ کے نزدیک غم ہی بندہ و مولا ہے، وجۂ ارتباط ہے اور روح کی بالیدگی کے لئے صرف دلِ اندوہگین کی ضرورت ہے۔"

دراصل نازکیؔ کے احساسِ غم کی گہرائی و گیرائی کے سرچشمے اُس معاشرتی ماحول اور کشمیر کی پچھلی حوصلہ فرسا تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں، جہاں غلامی، افلاس، دُکھ درد، ظلم و بے بسی اور بے کسی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

"دیدۂ تر" میں قطعات، غزلیات اور کچھ نظمیں ہیں۔ قطعات چو مصرعہ ہیں اور ان ہی سے نازکیؔ ایک قدآور شعری شخصیت بن گئے ہیں۔ اِن میں کچھ اُن کی فکر کے نفیس نمونے ہیں۔ اُن کی نظمیں انفرادی تاثرات اور تجربات پر کھڑی ہیں۔ اُن ایک قطعہ (جوانی کے بارے میں ملاحظہ ہو:-

کوئی کہتا ہے اس کو جاودانی ۔۔۔ کوئی کہتا ہے فانی ہے جوانی
نہ آگا اس کا ملتا ہے نہ پیچھا ۔۔۔ بڑی اُلجھی ہوئی ہے یہ کہانی

قطعات اور نظموں کی فکرِ عمیق، غزل میں سبک سری شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ غزل میں وہ کہیں کہیں کھرے طنز سے بھی کام لیتے ہیں۔ جس نے آپکی شاعری میں انفرادیت پیدا کی ہے ؎

اس شوخ کو کیا دیکھا آنکھوں میں سمٹ آئی
شیراز کی شادابی، کشمیر کی رعنائی

اب کس کو یقیں آئے جو چیز ہے فانی ہے
پیغامِ محبّت ہے اور ان کی زبانی ہے

مجھے بے طلب زندگی دینے والے
یہ احسان تیرا نہیں دشمنی ہے

فارسی اور اُردو روایات کو گلے لگانا اور قدیم اساتذہ کو اپنے ذہن میں رکھنا، نازکیؔ کی فطرت ہے۔ وہ کشمیر کے مشہور فارسی شاعر غنیؔ کشمیری سے والہانہ پیار کرتے ہیں۔ اسی عقیدت مندی کے سبب انھوں نے غنیؔ کے کلام کو مرتب کیا۔ وہ غنیؔ کے شیدائی اور عاشق لگتے ہیں، وہ غنیؔ کے فیض کو اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

کہاں میں، کہاں نغمۂ زندگانی
مرے روپ میں جلوہ فرما غنیؔ ہے

نازکیؔ کی شاعرانہ خوبیوں کا اندازہ ان کی غزل کے درجِ ذیل اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔

سر کو جنبش سی ہوئی چہرے سے زلفیں ہٹ گئیں
شام نے اک جھرجھری سی لی سویرا ہو گیا

دُور تا حدِّ نظر، میری نظر تھی ہم کاب!
ٹوٹ کیا آئی اُجالے میں اندھیرا ہو گیا

جادۂ اُلفت میں منزل کا تعین کیا کریں
جب مسافر ہار بیٹھا تو بسیرا ہو گیا

اِک نگاہِ ناز نے جھگڑے چکا وائے تمام
میں بھی تیرا ہو گیا میرا بھی تیرا ہو گیا

اقبالؔ اُردو شعراء کے لئے الہام کا باعث ہوئے۔ نازکیؔ کے اس اقتباس میں اسی اثر کا ردِّ عمل ملتا ہے۔

گفتگو کل ہو رہی تھی بُلبل و شہباز میں
دے دیا بُلبل نے شاہیں کی تعلّی کا جواب

ہے بظاہر تلخ لیکن یہ حقیقت ہے جناب
زندگی ہے سینکڑوں تاروں کی مرگِ آفتاب

—:—

# پنڈت نندلال کول طالب

طالب دورِ حاضر کے اُن شاعروں میں ایک مینار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جنھوں نے اُردو شعر و ادب کی ترویج کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ انھوں نے ہر وہ کوشش کی جس سے اُردو وادیٔ کشمیر میں پھلی پھولی اور ننھے پودے سے تناور درخت بن گئی۔ آج اس کی چھاؤں میں اس کے ہزاروں راہرو ٹھنڈک سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ نندلال طالب نے اُس وقت اُردو کی شمع کو فروزاں رکھا، اور جلا بخشی، جب کشمیر میں کشمیری زبان کی رَو بہہ رہی تھی اور یہاں کا ہر شاعر و ادیب یا فن کار سستی شہرت کے لئے "کشمیری" کو گلے لگا رہا تھا۔ صرف چند ہستیاں ہی تھیں جو اس دھارے میں نہ بہہ سکیں۔ اُن میں طالب سپہ سالار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

طالب نے اپنی شاعری کا آغاز اُس وقت کیا۔ جب تمام ہندوستان میں ترقی پسندی کا دور دورہ تھا۔ ترقی پسند اپنا پرچم لئے طنطنے سے رواں دواں تھے۔ باہر کرشن چندر، سجاد ظہیر، مُلک راج آنند، سردار جعفری، جوش ملیح آبادی، احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو اور کشمیر میں پریم ناتھ پردیسی دینا ناتھ نادم، غلام احمد مہجور، عبدالاحد آزاد، پریم ناتھ در، عبدالرحمٰن راہی غلام نبی فراق، محمد علی لون، اختر محی الدین وغیرہ ترقی پسند تحریک کے درِ رواں تھے۔ ترقی پسندی اور "نیچرل" شاعری بامِ عروج پر تھی۔ طالب

نے اِسی "زمانے" میں تخلیقِ فن کا آغاز کیا، اور کاروانِ ادب میں شامل ہوئے
جرسِ کاروانِ ترقی پسندی اُنھیں آواز دیتی رہی اور وہ اس "کاروان"
میں محوِ سفر رہے۔ کبھی اس کارواں کے ایک فعال رُکن بن گئے اور کبھی
CHANGE کے لئے اس سے الگ بھی ہوئے۔

نندلال طالب سرینگر کے ایک رئیس خاندان میں ۲۵ دسمبر ۱۸۹۹ء میں پیدا
ہوئے۔ اُن کے والد کا نام پنڈت ٹھاکر پرشاد تھا۔ وہ وادی کے جیّد سنسکرت عالم
تھے، خوشنویسی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ علم وفن کے اسی ماحول میں طالب پروان
چڑھے اور جو چیز انہیں وراثت میں ملی، اس کو انھوں نے اپنی کاوشوں سے
عظیم شعری عمارت میں کھڑا کیا۔ تواریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے جدِ امجد
پنڈت رگھوناتھ کول کشمیر کے وزیرِ اعظم رہ چکے تھے۔ اُن کے دادا دیوہ کاک کول
بھی اپنے وقت کے مانے ہوئے عالم، خوشنویس اور مصوّر تھے۔ موسیقی سے بھی اُنہیں
دلچسپی تھی۔ علم وفن، موسیقی اور مصوّری کے اس ملے جلے ماحول میں طالب کے
اندر کا شاعر تجربہ، تجسّس پاتا رہا اور عمر بھی اسی علمی وفنّی سمندر میں غوطے
لگاتے رہے اور گوہرِ مُراد حاصل کرتے گئے۔

درندر پرشاد سکسینہ بدایونی نے اِن کے حالاتِ زندگی اور شاعری پر ایک
مضمون لکھا ہے ("ہماری زبان" دہلی[۱]) اس مضمون کا حوالہ پروفیسر سروری نے
اپنی کتاب "کشمیر میں اردو" میں دیا ہے۔ ذیل میں ہم اس مضمون کا ایک
اقتباس دیتے ہیں:۔

"طالب نے پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔اے کیا اور اُردو کے امتحانات
بھی کامیاب کئے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ سری پرتاپ کالج
میں اُردو اور فارسی کے لیکچرار مقرر ہوئے، پھر ترقی کرتے کرتے پروفیسر

---

[۱] سروری صاحب نے یہ تو لکھا ہے کہ مذکورہ مضمون "ہماری زبان" میں
شائع ہوا تھا لیکن ان کے یہاں تاریخ اشاعت درج نہیں ہے۔

کے عہدہ پر مامور ہوئے اور کالج کی تعلیم کے ذریعے اپنے طویل تعلق کے باعث سینکڑوں نوجوانوں کے ذوق کی آبیاری کرتے رہے۔ خدمت سے وظیفہ پر سبکدوش ہونے کے بعد بھی ان کے ادبی مشاغل جاری رہے۔ چنانچہ وہ کئی ادبی اداروں کے رُکن رہے اور اس وقت کلچرل اکادمی کی جانب سے زیرِ ترتیب کشمیری لُغت کے لئے اُن کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔"

کشمیر کے عام شاعروں کی طرح طالب نے بھی اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا۔ شروع میں انھوں نے روایتی غزلیں لکھیں۔ ان میں روایت پسندی، زُلف وخال، لب ورخسار، حسن وعشق، جُدائی ووصال، امید وبیم اور یاس وغم صاف طور پر جھلکتے ہیں۔ طالب نے بہت سے اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی، ان غزل اور نظم قابلِ ذکر ہیں۔ غزل سے زیادہ اُن کے خیالات کی پختگی نظم میں نظر آتی ہے، جس دور میں انھوں نے آنکھ کھولی، اس وقت غزل "بکاؤ" چیز نہ تھی۔ نظم کی ادبی دنیا میں دھوم تھی۔ اس لئے انھوں کے وقت کے تقاضے کو سمجھ کر نظمیں ہی لکھیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اُن کی نظمیں، غزلوں سے گرانقدر اور فنی اعتبار سے بہت اچھی ہیں۔

آیئے۔ اب ہم ذرا ایک طائرانہ نگاہ اُن کی نظموں پر ڈالیں اور پھر اُنکی ابتدائی غزلوں کو بھی دیکھیں۔ یہاں پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ طالب نے WORDS. WORTH کی طرح اپنی نظموں میں منظر کشی اور فطرت کی مصوّری اتنی مشاقی سے کی ہے کہ نیچرل شاعری اور فطری شاعری کی ان کے یہاں رعنائیاں ہی رعنائیاں نظر آتی ہیں۔ اپنی نظم "بہارِ کشمیر" میں "شالامار" اور "ہاروَن" کی دلکشی یوں بیان ہوتی ہے ؎

نظم میں عینیت کا شائبہ:۔

شکستِ آرزو تھی لطفِ بہار دیکھوں      کاشانۂ چمن کے نقش ونگار دیکھوں

باغِ نشاط میں ہو، دل کو نشاط حاصل — تازہ نسیم ڈل ہو اور شالامار دیکھوں
کھل جائے مجھ پہ آخر رازِ ونیازِ اُلفت — بُلبل کے سامنے جب گُل کا سنگھار دیکھوں

منظر سرائی :۔

چھائی ہوئی گھٹائیں گھنگھور آسماں پر
برسا رہی تھیں موتی ابرِ بہار ہو کر
سروِ سہی کی شاخیں تھیں جھومتی ہوا سے
یا کوئی لڑکھڑاتا تھا بادہ خوار ہو کر

مناظر کا کیف دروں بینی کی طرف مائل ؛۔

جلوتِ میں نورِ کثرت، کثرت میں عین وحدت
آنکھوں میں آسمائے، اغیار، یار ہو کر
نقشِ دوئی مٹا دوں، کثرت سے دل ہٹا دوں
قدرت سمائے مجھ میں، قدرت میں میں سماؤں
غافل خودی سے رہ کر اپنا سروپ دیکھوں
وحدانیت کا نقشہ اس رنگ سے جماؤں

طالب نے چکبست کی طرح قومی اور مذہبی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان میں ہو بہو وہ چکبست کی پیروی کرتے ہیں، چکبست کا ہی انداز اور چکبست کا سوز و گداز اپناتے ہیں۔ یہ نظمیں مسدس کی شکل میں ہیں۔ مذہبی نظموں میں "سری کرشن جی کی یاد" بہت ہی اعلیٰ پایہ کی نظم ہے اور موثر اندازِ بیان نے اس میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ رامائن کے کئی سین کو بھی طالب نے نظم کا لبادہ پہنایا ہے۔ "سیتا جی اور راون" اس سلسلے میں بہت ہی بھلی اور انوکھی نظم ہے۔ "شیوراتری" (نظم) بھی اس سلسلے کی گراں قدر کوشش ہے۔ اس کا آغاز ملاحظہ ہو؎

کس قدر روشن ہے اپنی آج شام زندگی
لائی ہے شیوراتری تازہ پیام زندگی



(اردو روزنامہ "مارتنڈ" ۲۹ فروری ۱۹۳۶ء)

طالبؔ نے جدید انداز میں کچھ مرثیے بھی لکھے ہیں، جن میں اپنے دوستوں اور عزیزوں کے غم کو انتہائی رقت آمیز انداز میں بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے۔ طالبؔ نے اپنی آنکھوں سے جو انقلابات دیکھے وہی اپنی نظموں میں بیان کئے ہیں، انھوں نے وقت کے ساتھ شانہ سے شانہ ملا کر اُن انقلابات کا خیر مقدم کیا۔ اُن کے افکار و اسالیب میں جا بجا تبدیلیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اس سلسلے میں بطورِ مثال یہ نظمیں پیش کی جا سکتی ہیں "بہار"، "جلوہ دلدار"، "عالمِ مجاز"۔ یہاں حفیظ جالندھری کا رنگ و آہنگ ملتا ہے ؎

بہار میں شباب ہے　　　شباب انتخاب ہے
نظر کی آب و تاب ہے　　　کہ حُسن لاجواب ہے
عذاب ہے، ثواب ہے　　　سکون و اضطراب ہے
یہ عالمِ مجاز ہے　　　کہ زندگی کا راز ہے

("عالمِ مجاز" سے ماخوذ)

"عالمِ مجاز" کی صفات ؎

کبھی خوشی ہے دمبدم　　　کبھی ہے حسرت و الم
کبھی ستم پہ ہے ستم　　　کبھی ہے موجزن کرم
یہ شانِ عظمت و حشم　　　یہ محفلوں میں جامِ جم
یہ عالمِ مجاز ہے　　　کہ زندگی کا راز ہے

"عورت" اور "سورج کی کرن" وغیرہ میں طالبؔ مستزاد کو اپنا رہے ہیں۔ "مرزا غالب" اور "نور جہاں" پر اُن کی نظمیں موثر ہیں۔ طالبؔ نے پروفیسر جیلال کول کے ساتھ "للہ دید" کی کچھ شاعری (واکھ) کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے یہ دراصل اُن کے طویل تحقیقی کام کا ایک سلسلہ ہے۔ "بہارِ گلشن کشمیر" جو کہ کشمیری شعراء کا ایک یادگار تذکرہ ہے، پر بھی انھوں نے ایک بسیط مقدمہ لکھا ہے۔ اِسکے علاوہ لالہ سری رام کی "خمخانۂ جاوید" میں انھوں نے ایک منظوم تفریظ بھی لکھی ہے اس

تقریظ میں تقریباً ایک سو مشاہیر کا ذکر آتا ہے۔ اس کا انداز اور ہیئت مثنوی کا ہے۔ آغاز تشبیب سے ہوتا ہے۔ تذکرہ کا حال دیکھئے :-

کہیں کرسی نشیں تھے میر و سودا
کہیں سوز اور جرأت، درد و انشاء
کہیں تھے حاتم و تاباں و ناسخ
کہیں مومن، اسیر و برق و راسخ

پروفیسر عبدالقادر سروری اپنی کتاب "کشمیر میں اردو" میں طالب کی تنقیدی بصیرت کا یوں ذکر کرتے ہیں :-

"طالب کے تنقیدی مضامین بھی رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کا مضمون "علامہ کیفی دہلوی کی یاد میں" "شیرازہ" (جنوری سنہ ۶۲ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں علامہ کیفی سے اپنے مراسم اور ان کی ادبی اصلاحوں کا تذکرہ کیا ہے۔ مضمون اُستاد کے ساتھ عقیدت مندی کا آئینہ دار ہے۔ اور کیفی کے ادبی مزاج کو سمجھنے میں بہت معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ اس میں طالب کے نام کیفی کے لکھے ہوئے خطوط بھی شامل ہیں"

طالب کی شاعری اگرچہ مروّجہ رسم کے مطابق غزل سے شروع ہوئی۔ مگر روایتی غزل گوئی سے وہ عصری مذاق تک سفر کر گئے۔ اپنے APICS میں نظمیں لکھیں۔ "رشحاتِ تخیل" کے نام سے سنہ ۱۹۲۵ء میں اُن کا شعری مجموعہ شائع ہوا۔ اس میں غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی (قومی و مذہبی موضوعات پر) ملتی ہیں۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں ان کا ایک اور مجموعہ "مرقع افکار" شائع ہوا۔ اس میں شروع سے آخر تک نظمیں ہی نظمیں شامل ہیں۔

ابتدائی غزل کے چند نمونے ملاحظہ ہوں :-

گیا دل ہاتھ سے، اور دلِ مستاں کے ہاتھ کیا آیا

اُڑا آنکھوں سے مطلب، رازداں کے ہاتھ کیا آیا
میری آنکھوں میں حسنِ یار کی تصویر پنہاں تھی
تو میرے روکنے سے پاسباں کے ہاتھ کیا آیا

برج موہن دتاتریہ کیفی نے "مرقع افکار" کے مقدمے میں نندلال طالب کی شاعرانہ صلاحیتوں کو سراہتے ہوئے اُنھیں ایک باکمال شاعر قرار دیا ہے۔

پنڈت کیفی کے الفاظ میں :-

"طالب کے کلام میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر طرز میں اپنا رنگ جما لیتے ہیں۔ اپنے وقت پر وہ یقیناً صاحبِ طرز مانے جائیں گے۔ احساسِ قلبی کی تصویر کھینچنے میں ان کو کمال کا درجہ حاصل ہے، یہی حال حقائق نگاری کا ہے۔ مناظرِ قدرت جیسا سچّا اور دلکش نقشہ کھینچتے ہیں تعریف کے قابل ہیں۔"

(برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی۔ جموں ۴ فروری ۱۹۵۲ء)

اِس طرح "رشحاتِ تخیّل"، "رنگِ سخن" اور "مرقع افکار" کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ طالب میں ایک بڑا شاعر بننے کی پوری صلاحیت موجود تھی، لیکن جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ طالب شاعر ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجے کے محقق اور نقّاد بھی تھے۔ اس لئے وہ شاعری کی طرف اتنی توجہ نہ دے سکے، جتنی توجہ کی حقدار اُن کی شاعری تھی۔ پھر بھی طالب کا شعری سرمایہ اُن کے تخلیقی ذہن، قادرالکلامی اور فنکاری کا ثبوت دیتا ہے اور اس اعتبار سے طالب کشمیر کے صفِ اوّل کے اُردو شاعروں میں اہم مقام رکھتے ہیں۔

—— ⁘ ——

# ڈاکٹر حامدی کاشمیری

آپ کا نام حبیب اللہ ہے۔ حامدی تخلص کرتے ہیں اور ادبی دنیا میں حامدی کاشمیری کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ وادی کے لکھنے والوں میں آپ متنوع ادبی دلچسپیوں کی بدولت ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔

آپ ۱۹۳۲ء میں سرینگر کے محلہ بہوری کدل میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سری پرتاپ کالج سرینگر میں پائی۔ ۵۴ء میں انگریزی میں اور ۵۸ء میں اردو میں ایم اے کیا۔ ملازمت کا آغاز کالج کی لیکچراری سے ہوا۔ پہلے انگریزی کے لیکچرر مقرر ہوئے اور اسی دوران حیدرآباد کے انگلش انسٹی ٹیوٹ سے انگریزی زبان و ادب کی تدریسی تربیت بھی حاصل کی۔ کچھ عرصہ جموں و کشمیر کلچرل اکادمی کے مددگار معتمد کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ ۶۲ء میں آپ کشمیر یونیورسٹی میں بحیثیت لیکچرار داخل ہوئے۔ آج آپ صدر شعبۂ اردو ہیں۔ ۶۶ء میں "جدید اردو نظم اور یورپی اثرات" کے موضوع پر مقالہ سپردِ قلم کر کے جموں و کشمیر یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

حامدی صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا اور ہندو پاک کے ممتاز رسائل میں اُن کے افسانے پابندی سے شائع ہوتے رہے۔ پھر انھوں نے شاعری کی طرف توجہ کی اور شہزور کاشمیری سے چند تخلیقات پر اصلاح لی۔ رفتہ رفتہ حامدی کاشمیری افسانے سے قطع تعلق کر کے شاعری ہی کے

ہو کر رہ گئے۔ کچھ عرصہ بعد شاعری کی جانب بھی اُن کی حسب خواہ توجہ نہ رہی اور وہ تنقید کی طرف رجوع ہوئے۔ اس طرح حامدی کاشمیری کی ادبی شخصیت کے تین پہلو ہیں :-

۱۔ افسانہ نگار ۲۔ شاعر ۳۔ نقّاد

پہلے افسانوی مجموعہ "وادی کے پھول" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے بعد تین ناول "بہاروں میں شعلے"، "پگھلتے خواب" اور "بلندیوں کے خواب" شائع ہوئے۔ افسانوں کے دو نئے مجموعے "برف میں آگ" اور "سراب" ابھی چند سال پہلے شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ اپنے افسانوں میں حامدی نے افسانوں کے نازک احساسات اور رومانی تجربات کا اظہار انوکھے انداز سے کیا ہے۔ اِسی لئے اُن کے افسانوں کے کردار اور واقعات اور اُن سے پیدا ہونیوالی کیفیات آج بھی لوگوں کو یاد ہیں۔

زیرِ نظر مقالہ چوں کہ شاعری کا ہی احاطہ کرتا ہے۔ اس لئے ہم حامدی کاشمیری کی ہمہ جہت شخصیت میں سے صرف اُن کی شاعری پر ہی طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔ کیونکہ اس مقالے میں اس پہلو کا بھی جائزہ لینے کی زیادہ گنجائش نہیں ہے۔

حامدی کاشمیری بحیثیت شاعر ۱۹۶۰ء میں اردو شاعری کی دنیا میں داخل ہوئے۔ انھوں نے اسی سال اپنے کلام کا پہلا مجموعہ "عروسِ تمنا" شائع کیا۔ اس مجموعہ کو ریاستی کلچرل اکادمی کی طرف سے انعام ملا۔ "عروسِ تمنا" میں اُن کے ایامِ جوانی کا کلام شامل ہے۔ اس میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ اگرچہ "عروسِ تمنا" حامدی کی شاعری کا نقشِ اوّل ہے۔ لیکن اس سے دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔ اوّل یہ کہ حامدی کسی بھی طرح کے خیال و فکر، احساس یا جذبے کو شعر کے سانچے میں ڈھالنے کی بھر پور صلاحیت رکھتے ہیں۔ دوم یہ کہ "عروسِ تمنا" کا شاعر روایت سے وابستہ ہونے کے باوجود نئے شعری تقاضوں کی روشنی میں اپنی بات نئے اور زیادہ موثر انداز میں کہنے کا بھی سلیقہ رکھتا ہے۔

"عروسِ تمنّا" سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

فلک سے آہی گیا میری آہ کا یہ جواب
وہ دل ہی کیا کہ جو سوزِ الم کی لائے نہ تاب

تری نظر ہی پہ غالب ہیں سب حجاب و قیود
کہا یہ کس نے کہ حسنِ ازل ہے زیرِ حجاب

⁂

قبائیں چاک پھولوں کی تو بلبل شعلہ آواز
قیامت خیز ہے دوشیزۂ فطرت کی انگڑائی

تمنّا مسکرائی، آرزو کے پھول جھکے ہیں!
تو پاس آئی مرے، ویرانۂ دل میں بہار آئی

حامدی کاشمیری نے بڑی حد تک شروع ہی سے روایتی انداز کی شاعری سے انحراف کیا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اُن کا طرزِ سخن روایتی انداز سے ہٹا ہوا ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنے کچھ اور معاصر شعراء کی طرح پرانے نظام کو نئی شکل دینا چاہتے ہیں۔ وہ کائنات میں جمود سے گھبراتے ہیں، اس کی جگہ فعال اور زندگی سے بھرپور ہما ہمی لانا چاہتے ہیں۔ اسی لئے وہ فرماتے ہیں ؎

تو آ بتائیں گے ہم پیار کا نیا معیار
بدل ہی ڈالیں یہ کہنہ نظامِ فکر و نظر

"عروسِ تمنّا" میں اس طرح کے انتظار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً شروع میں حامدی کاشمیری پر کسی نہ کسی طرح ترقی پسند تحریک کا بھی اثر تھا۔ "عروسِ تمنّا" میں چند نظمیں اپنے وطن کشمیر سے بھی متعلق ہیں۔ اِن نظموں میں شاعرانہ فنکاری عروج پر نظر آتی ہے۔ مقامی دلکشیوں سے نظموں کو اس طرح آراستہ کیا گیا ہے کہ شاعر کے ذہنی تاثرات کی پوری نمائندگی ہوتی ہے۔ "جشنِ بہاراں"، "گلمرگ"، "شالیمار کی ایک شام" اور "شامِ خزاں" ایسی نظمیں ہیں، جن سے اُن کی ذرد دل

بینی ہویدا ہوتی ہے۔ وہ ہر بیرونی دلچسپی، مظاہر و حقائق اور تجربات و مشاہدات کو اپنی ذات کے اندر سمیٹتے ہیں اور پھر انہیں اپنی تخلیقی قوت کی آگ میں تپا کر ایک نئی تخلیقی حقیقت تجربہ یا مشاہدہ کی شکل میں سلیقے سے پیش کرتے ہیں۔ "شامِ خزاں" میں اپنے آپ میں ڈوب جانے کا منظر ملاحظہ ہو ؎

مری نگاہ دھندلکوں میں کھوئی جاتی ہے
مری حیات کے ان ہی اُداس لمحوں میں
جو یاد آتی ہے، زخموں کی یاد آتی ہے

اپنے من میں ڈوب جانے کے عمل سے حامدی صاحب نے بھرپور فائدہ اُٹھایا ہے۔ اسی مخصوص رجحان سے اُن کی نظمیں اور غزلیں دونوں ہی پایاب ہوتی ہیں۔

حامدی صاحب کی یہ ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ وہ قدم تیز تر کر کے اپنے ہم عصر شعراء سے آگے نکل جائیں اور ایسا کرتے ہوئے وہ اکثر کامیابی سے ہم کنار بھی ہوتے ہیں۔ نئے اسالیب، نئے موضوعات اور نئی علامتوں کا سہارا لے کر انھوں نے اپنے لئے ایک منفرد مگر اعلیٰ مقام حاصل کیا ہے ؎

رات جلتی جبیں پہ لہرائے — تیرے ہاتھوں کے شبنمی سائے
تیرے چہرے پہ غم کا سایہ ہے — کتنے لمحوں کے چاند گہنائے
دشتِ شب میں کہیں سحر نہ ملی — ہم اُسے دور تک پکار آئے

حامدی صاحب کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف ڈاکٹر برج پریمی نے اپنے مضمون جموں و کشمیر میں اردو تنقید و تحقیق۔ "تعمیر" کا جموں و کشمیر اردو ادب نمبر میں اس طرح کیا ہے:۔

"حامدی نے عرق ریزی سے جدید اُردو نظم کے صوری اور معنوی پہلوؤں کا مطالعہ کیا ہے۔ اُردو نظم پر یورپی اثرات کی نشاندہی کر کے ایک خالص تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے حامدی آرٹ کی قدر و قیمت متعین کرتے وقت شاعر سے زیادہ شعری کائنات کو زیادہ اہم قرار

دیتے ہیں اور بقول خود اس آئینے میں شعری شخصیت کے نفسیاتی
خد و خال تلاش کرتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ حامدی صاحب روایات سے نہ صرف بغاوت کے عادی ہیں، بلکہ آپ اسلوب کو بیجا جکڑ بندیوں سے آزاد کرانے کی فکر میں بھی رہتے ہیں۔ اس کا اعتراف پروفیسر منیب الرحمٰن یوں کرتے ہیں۔

"نئی شاعری کے سلسلے میں جس کی ابتدا ریاست ۶۵ء کے بعد ہوئی، حامدی کاشمیری نے پیشرفت کی۔ روایتی اور رومانی شاعری سے کنارہ کش ہو کر انھوں نے موضوع اور اسلوب کو بے جا جکڑ بندیوں سے آزاد کر اکے نئے شعری تقاضوں کے مطابق کر دیا۔ حامدی کاشمیری کی شاعری نہ صرف اسلوب اور آہنگ کے لحاظ سے ایک نئی سمت اختیار کر گئی، بلکہ ان کے موضوعات عصری تقاضوں کے پیشِ نظر زیادہ پیچیدہ اور تہہ در تہہ ہو گئے۔ ان کی شاعری میں ان تبدیلیوں کے نتیجے میں زبان و بیان کی چستی اور دروبست وجود میں آئے۔"[1]

حامدی کاشمیری سے ہی کشمیر میں جدید اردو شاعری شروع ہوتی ہے حامدی کا دائرۂ کار نہ صرف وسیع ہے، بلکہ وہ ادب کو خالص ادبی نقطۂ نظر سے پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن نظموں اور غزلوں میں حسی اور بصری پیکروں کی خوبصورت مثالیں ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج حامدی صاحب آج پوری ادبی دنیا میں معروف ہیں۔ اُن کی غزلیں جدید احساس اور طرزِ بیان سے آراستہ ہو کر دو آتشہ ہو گئی ہیں۔ وہ معتبر شعراء کے اثرات سے مبرّا نہیں ہیں، مگر اُنھوں نے کبھی بھی اپنی انفرادیت کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ عہدِ حاضر میں برِ صغیر کے غزل گو شعراء میں حامدی صاحب ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔

حامدی صاحب کو اپنے اشعار میں طلسمی صورت حال تخلیق کرنے سے بھی

---

[1] "ریاست کی نئی اردو شاعری"۔ از منیب الرحمٰن۔ "تعمیر" کا جموں و کشمیر ادب نمبر۔

دلچسپی ہے۔ پیکر تراشی اور استعاراتی اظہار ان کی شاعری میں اکثر نمایاں ہو جاتا ہے۔ برف، شجر، پہاڑ، سایہ، آسیب، دشت، صحرا، سیاہ ناگ، سنگ وغیرہ اُن کی شاعری میں استعاراتی نظام فراہم کرتے ہیں۔ وہ اپنے مخصوص رجحان سے فکر و احساس کی نمائندگی کرتے ہیں، تحیّر ان کی طلسمی دُنیاؤں کا ایک اہم عنصر ہے۔ عصری ماحول اور زندگی اور زندگی کی بے معنویت اور لاحاصلی اور بنجر پن کا احساس ان کی غزلوں میں نُمایاں ہے :۔

سو گئے، پھر کبھی نہیں جاگے
دور سے سایۂ شجر دیکھو
برف باری کی تیرگی دن کو
رات کو بارشِ شرر دیکھو
ساحلوں پہ وہ منتظر ہوں گے
ہے کوئی موج معتبر دیکھو

:.

شب کو سورج سروں پہ جلتا ہے
لوگ آسودہ خواب کیا ہوں گے
ابر آئے گا کھُل کے برسے گا
وہ اگر شاملِ دعا ہوں گے

— :. —

# شہ زورؔ کاشمیری

آپ کا اصلی نام غلام قادر ہے۔ سری نگر کے ایک خوشحال گھرانے میں ۱۹۱۵ء میں تولد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سری نگر میں پائی۔ بی اے پاس کر کے سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے اور ترقی کرتے کرتے فائنانشل ایڈوائزر کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ اس وقت حکومت سے وظیفہ پا رہے ہیں اور اپنا سارا وقت شعر و سخن پر صرف کرتے ہیں۔ تخلیقی سفر شدّ و مد سے جاری ہے۔

شہ زورؔ پچھلے پچاس سالوں سے شعر و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ فن پر قدرت پانے کے لئے انھوں نے ان تھک محنت اور ریاضت سے کام لیا ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے اب برِصغیر ہند و پاک میں استادی کا مرتبہ پالیا ہے۔ شہ زورؔ شعر و سخن کے ساتھ ساتھ فنِ موسیقی سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اسی دلچسپی کے باعث ان کی شاعری غنائی Lyarical ہو گئی ہے۔

یوں تو ان کو شعر و ادب سے بچپن سے ہی لگاؤ رہا۔ مگر باضابطہ شاعری کا آغاز اس وقت کیا، جب وہ میٹرک کے طالب علم تھے۔ سری پرتاپ کالج کے میگزین "پرتاپ" میں ان کا کلام اکثر شائع ہوتا تھا۔ مولانا محمد سعید (جو دادی کے جیّد عالم اور بزرگ سیاستداں ہیں) سے ملاقات ہوئی تو کلام سنا، متاثر ہوئے اور سیماب اکبر آبادی سے مشورۂ سخن کی رائے دی۔ سیماب ان دنوں محض شاعر ہی نہیں، بلکہ اردو شعر و ادب کا ایک مکمل ادارہ تھے۔ انھوں نے شہ زورؔ کو

"آگ سے نکال کر کندن بنا دیا۔ سیماب نے شہ زور کی مسلسل ریاضت اور لگن کو دیکھ کر انھیں استادی کی سند عطا کی۔ چنانچہ وہ ریاستِ جموں و کشمیر میں معتبر اور مستند معلّمِ شاعری ہو گئے۔ ان کی تربیت اور مشوروں سے آج بھی بہت سے نوجوان شاعر مستفید ہو رہے ہیں۔

زبان و بیان، عروض، محاورہ اور شعری اسالیب جو بھی شہ زور نے اپنے اُستاد سے سیکھے اُن کو بخوبی اپنی شاعری میں برتنے کی وجہ سے انھیں فنّی نکات پر قدرت حاصل ہو گئی۔ لیکن شہ زور نے کبھی بھی محض فن کے بل بوتے پر شعر نہیں کہے۔ بلکہ اُن کا فطری شاعرانہ ذوق ہی اُنھیں شعر کہنے پر اُکساتا رہا۔ اِس لیے اُن کی شاعری میں فنّی رچاؤ کے ساتھ خالص تخلیقی، جمالیاتی اور فکری عناصر ملتے ہیں۔

مروّجہ رسم کے مطابق شہ زور نے بھی اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا۔ ان کی ابتدائی غزلوں کو چھوڑ کر اُن کا تخلیقی شعور سستے تغزّل کا روادار نہیں رہا۔ نہ ہی اُن کے خیالات جامد رہے۔ وہ اپنے دور کے ساتھ چلتے رہے اور نئی نئی تبدیلیوں اور تقاضوں سے نشو و نما پاتے رہے۔ ابتدا میں اگرچہ حسن و عشق، لب و رخسار، ہجر و وصال، جام و مینا سے بھی ٹکرائے۔ مگر یہ "ملاقات" زیادہ دیر تک قائم نہیں رہی۔ اُنھوں نے اپنے عہد کے فنّی اور سماجی شعور کو اپنے فن میں سمونے کی کوشش کی۔

نئی غزل کے تخلیق کاروں کی طرح انھوں نے بھی رمزیت اور علامات سے کام لیا ہے۔ وہ جہاں کلاسیکی غزل کے روادار ہیں، وہاں ترقی پسند نظم پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ وہ قدیم اصنافِ سخن قطعہ اور رباعی پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ وہ مختصر خیال کو مربوط انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ فن کا اعجاز متاثر نہیں ہو پاتا۔ رباعی ہو یا قطعہ، غزل ہو یا نظم شہ زور ہر ایک پر اُستادانہ حد تک گرفت رکھتے ہیں۔ اگرچہ اعلانیہ طور پر شہ زور ترقی پسندوں سے دور رہے، مگر اُن کا ذہن کبھی بھی خوابِ خرگوش میں نہیں رہا، اُن کا شعور بیدار رہا۔

طبقاتی کشمکش، اونچ نیچ، غریبی اور امیری کے فرق کو وہ سمجھتے تھے، مگر اس کو اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھنا معیوب نہ سمجھتے تھے۔

شہ زور بسیار گو ہیں، لیکن بسیار گوئی نے انہیں کہیں بھی بلند مرتبہ سے نہیں گرایا۔ وہ فن کا مینار تھے اور مینار ہی رہے۔ انھوں نے اپنی نظموں کا ایک مجموعہ کشمیر اور کشمیر کے مناظر پر شائع کیا۔ اس مجموعہ میں "وادیٔ کشمیر" "شالامار باغ" "پری محل" اور "شفقِ شام جھیل ڈل کے کنارے" بڑی قابلِ قدر نظمیں ہیں۔ فنی اعتبار سے یہ نظمیں کسی بھی اردو کے بڑے شاعر کی نظموں کے مدِ مقابل رکھی جاسکتی ہیں۔ یہ نظمیں بظاہر رسمی اور روایتی موضوعات کو چھیڑتی ہیں، لیکن ہمارا یہ شاعر مناظر سے گزر کر روحِ حسن تک پہنچتا ہے۔ وہ ماضی کی یادوں کو، جو رومانی بھی ہیں اور تاریخی بھی، اس طرح قاری کے سامنے پیش کرتا ہے کہ قاری ان میں نہ صرف کھو جاتا ہے، بلکہ تہہ در تہہ ایک نئی ہی دنیا بھی پا لیتا ہے۔ جس میں رنج وغم، نشاط و الم کے سوا اور بھی کچھ ہوتا ہے۔

"وہ افلاس کی اٹھتی ہوئی نظروں کو زر کے تودوں کی طرف بڑھتے بھی دیکھ لیتا ہے اور نغموں کی تہہ میں دبی دبی کراہ کو بھی سن سکتا ہے پھر خیالات کا سلسلہ اس حقیقت۔ نفسِ لامری کی طرف رہبری کرتا ہے کہ:-

یوں ہی یہاں سے جانے کتنے گذر گئے ہیں

آئے تھے یہ کہاں سے، آکر کدھر گئے ہیں"[1]

فسادات پر شہ زور نے بڑی اچھی نظمیں لکھی ہیں۔ کشمیر کے تقریباً سبھی شاعر علامہ اقبال کے فکر و فن سے متاثر ہوئے ہیں۔ شہ زور بھی انہیں اس طرح خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:-

---

[1] "کشمیر میں اردو" از پروفیسر ...

حکیمِ امّتِ مرحوم، آشنائے راز
تھی جس کے فکر کے طائر کی عرش تک پرواز

وہ جس نے ذہن کی افتادگی کو رفعت دی
وہ جس نے فکر کی پژمردگی کو نزہت دی
بُلند جس نے کیا ہند میں نوائے خودی
وہ سارے شرق کا اقبال وہ خدائے خودی

اپنی زبان دانی اور خیالات کی وسعت پر ناز کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں:۔

میں نے جذبات کو کونین کی وسعت دی ہے
فکر کو کنگرۂ عرش کی رفعت دی ہے
نطق کو کوثر و تسنیم کی عزّت دی ہے
اور تخیئل کو شادابیٔ جنّت دی ہے

⁘

تم مجھے ذہن بدر، ملک بدر کر دو گے
زہر سے ساغرِ امید مرا بھر دو گے

⁘

سب کو اک مرکزِ اُلفت سے پکارا میں نے
کیا کوئی روپ ہے ایسا جو نہ دھارا میں نے

حُب الوطنی سے بھرپور نظم ملاحظہ ہو:۔

ہیں لالہ و گل رد کشِ حورانِ جناں آج
صد غیرتِ تسنیم ہے ہر جوئے رواں آج
ہر ایک شجر سدرہ و طوبیٰ ہے یہاں آج     ہر شاخِ نشیمن پہ ہے گلبانگ جواں آج
ہے وادیٔ کشمیر پہ جنّت کا گماں آج

غنچوں کے لبوں پہ ہے محبت کا تبسم
سبزے کا سراپا ہے مسرت کا تبسم
ہر منظرِ گلشن ہے قیامت کا تبسم

کانٹوں نے بھی سیکھی ہے محبت کی زباں آج
ہے وادیٔ کشمیر پہ جنت کا گماں آج

گل خیز ہے، گل بار، گل پوش ہے کشمیر
کیفیت و تنویر کی آغوش ہے کشمیر
ایک حجلۂ رنگیں میں نواجوش ہے کشمیر

کشمیر نہاں رہ کے بھی ہے خوب عیاں کشمیر
ہے وادیٔ کشمیر پہ جنت کا گماں آج

مے ریز فضائیں ہیں، گھٹائیں ہیں گہر بار
سرشار ہیں اشجار تو بدمست ہیں انہار
بارش کی چھما چھم ہے کہ پازیب کی جھنکار

ہے صحنِ چمن رقص گہِ زہرہ وشاں آج
ہے وادیٔ کشمیر پہ جنت کا گماں آج

اپنے عہد کے فنی اور سماجی شعور کو غزل میں سمونے کی کوشش دیکھئے:-

میرا گوہرِ سخن جو ترے کان تک نہ پہنچا
مرے کم نصیب فن کا وہی شاہکار کیوں ہو

⁂

المدد! اے تصورِ جاناں — تا بحدِ نظر ہیں ویرانے
یہ تعلق بھی کیا قیامت ہے — تم نہ میرے ہوئے نہ بیگانے

⁂

نئی غزل کا نیا آہنگ رمزیت کے ساتھ ملاحظہ ہو:۔

دامانِ گلستاں پر ہے خزاں پھر سایہ فگن اب کیا ہوگا
آغوشِ محن اور سرو سمن، یارانِ چمن اب کیا ہوگا

میخانہ نیا، ساغر بھی نئے، ساقی بھی نیا، مے کش بھی نئے
تجھ سے اک کیف نیا حاصل، صہبائے کہن اب کیا ہوگا

خوں بار شفق ہے کیا جانے، کتنوں کا سہاگ اترا دن میں
ہے شام کے سر پر کالا کفن، اے شب کی دلہن اب کیا ہوگا

شہزور وہ حق ہیں، حق گو، منصور کا جو ہم مشرب ہے
ہیں اس سے خفا یارانِ وطن، اے دار و رسن اب کیا ہوگا

⁂

اصناف میں ایجاز کا فن، چند قطعات اس سلسلے میں ملاحظہ ہوں:-

جنوں میرا تو میرا ہی جنوں ہے — نہ کیوں حیراں ہوں اربابِ ادراک
جنوں کا مظہرِ اکمل ہوں لیکن! — گریباں ہے نہ دامن ہی مرا چاک

⁂

حدیثِ شوق میری مقتضی ہے — کہ اپنی زیست کے ٹکڑے ملالوں
اگر زحمت نہ ہو، اے موت آجا — میں اپنی عمرِ رفتہ کو منالوں

⁂

رباعیات ملاحظہ ہوں:-

بے سود ہے تہدیدِ عقل و دانش — اور راہنما کی یہ جہد و کوشش
ٹھوکر ہی سکھاتی ہے سنبھل کر چلنا — تقویٰ ہے حقیقت میں شعورِ لغزش

⁂

اے بے خبر از موجود لا موجود — ہیں دہر میں لاکھوں دنیا نامشہود
محدود جہاں ہو یہ ناممکن ہے — اک ذرہ نہیں اس دنیا میں محدود

⁂

حاکم سیلِ جبر ابھی تند و تیز ہے — ہر اک دیار آج بھی محکوم خیز ہے
خواجہ پرست آج بھی مزدور ہے یہاں — پائے خدائے زر پہ گدا سجدہ ریز ہے
خونخوار ذہنِ قیصر و مغفور ہے ابھی
اے وقت دورِ امن و سکوں دُور ہے ابھی

⁘

زبان پر قدرت اور خیالات کی وسعت ملاحظہ ہو:-

صُبحیں جو معطّر ہیں تو شامیں ہیں منوّر
پُر کیف جو راتیں ہیں تو دن مست ہیں یکسر
ہر لمحہ جمیل و مترنّم ہے سراسر

ہر آن طرب ناک ہے اور بادہ چُکاں آج
ہے وادیٔ کشمیر پہ جنّت کا گماں آج

خاموشیٔ اشجار میں ہے جوشِ تکلّم
مستانہ ہواؤں میں ہے آہنگ و ترنّم

بادۂ تقدیس کے ساغر چھلکتے ہیں یہاں — گُل چٹکتے ہیں یہاں بُلبل چہکتے ہیں یہاں

عود کی خوشبو سے ہے ساری فضا مہکی ہوئی
انتشارِ کیف سے ساری فضا بہکی ہوئی
سُرخ رنگوں سے ہے یوں خاکِ چمن لہکی ہوئی
ہو چمن میں جس طرح گُل کی قبا دہکی ہوئی

— ⁘ —

# شوریدہ کاشمیری

آپ کا پورا نام غلام محمد شوریدہ کاشمیری ہے۔ وادئ کشمیر کے یہ سربر آوردہ شاعر، شوپیان کے ایک موضع پنجورہ میں پیدا ہوئے۔ سنِ پیدائش ۱۹۲۴ء اور خاندانی پیشہ زراعت ہے۔ غیر تعلیمی ماحول میں شوریدہ نے فارسی اور اُردو میں ایم اے کیا۔ لیکچرار کے عہدے تک پہنچے۔ پچھلے کئی سالوں سے تحقیق کا کام کر رہے ہیں۔

شوریدہ ایک بالغ نظر شاعر اور ادیب ہیں۔ بسیار گو ہیں، کافی کلام جمع کیا ہے۔ اپنی محنت اور ریاضت سے اُردو کے ایوانوں تک رسائی حاصل کی۔ شعر و سخن کے ہر علاقے سے باخبر ہیں۔ سنجیدہ و مزاحیہ دونوں اصناف پر ان کو دسترس حاصل ہے۔ شروع میں آثر صہبائی سے مشورۂ سخن کیا، پھر اَن تھک محنت نے انہیں استادِ کامل بنا دیا۔ اور اب وادی کے اچھے اور صاحبِ فکر شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ شاعری کی تقریباً ہر صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن ان کی غزل گراں قدر اور قابلِ ذکر ہے۔

شوریدہ کبھی بھی کسی خاص اسلوب میں نہیں لکھتے، کبھی وہ سنجیدہ لکھتے ہیں اور کبھی اُن کے اس سنجیدہ آہنگ میں اندر ہی اندر مزاح کی شوخیاں بھی

کلبلانے لگتی ہیں، اور یہی اُن کی پہچان بن جاتی ہے۔ ترقی پسندی سے زیادہ شوریدہ کلاسیکیت کے شیدائی ہیں۔ زندگانی کی حقیقتوں سے بھی آنکھیں ملاتے ہیں اور مقصدیت کے ایوانوں میں جلوہ افروز ہوتے ہیں۔

اُن کی سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری کا سنگم دیکھئے :-

سوزِ پنہاں سے دل کباب ہوا　　آشیانہ ترا خراب ہوا

حُسنِ نظّارہ سوز نے مارا　　بے حجابی میں بھی حجاب ہوا

ہائے وہ اوّلیں نگاہ کہ جب　　دل میں برپا اِک انقلاب ہوا

⁂

اقبالؔ کا ناصحانہ انداز غزل میں یوں عیاں ہے :-

حجاباتِ تعصب کاش ہٹ جائیں نگاہوں سے
ہُنر میں عیب ظاہر، عیب میں ہوگا ہُنر پیدا

تگ و تازِ جنوں، اے دل نہیں محدود صحرا تک
مکاں و لامکاں میں بھی کر اپنی رہ گزر پیدا

شہودِ غیب کے جلوے نظر آئیں گے شوریدہ
جو ہو داغِ جگر، سودائے سر، ذوقِ نظر پیدا

— ⁂ —

# حکیم منظورؔ

محمد منظور ۱۷ جنوری ۱۹۳۷ء میں شہر سرینگر کے محلہ گوجوارہ میں پیدا ہوئے۔ گھرانہ خوشحال اور تعلیم یافتہ پایا۔ ان کے والد کا نام الحاج حکیم علی محمد تھا۔ وہ خوش گفتار شعر فہم تھے۔ پیشے سے حکیم مگر طبعاً ادب نواز واقع ہوئے تھے۔ عربی، فارسی اور اُردو زبانوں کے مستند شعراء سے واقف تھے۔

ابتدائی تعلیم حکیم منظورؔ نے گھر کے علمی ماحول میں پائی، میٹرک ریاست کے ایک مشہور اسکول سے کامیاب کیا۔ مزید تعلیم کے لئے کالج میں داخلہ لیا مگر نامساعد حالات کے سبب کالج جانا چھوڑ دیا، اس طرح تعلیم نامکمل رہی۔ چونکہ منظور صاحب نے ادبی وعلمی ماحول میں تعلیم پائی تھی، اس لئے ادبی ذوق وشوق تکمیل پاتا رہا۔ سونا آگ سے گذر کر کندن ہوا کے مصداق حکیم منظور پلے بڑھے اور جوان ہوئے گورنمنٹ سروس میں بحیثیت کلرک داخل ہوئے، اور ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے ٹریڈ کمشنر ہو گئے۔ اور آج کل دہلی میں تعینات ہیں۔ حکیم منظور کو کالج کے زمانے سے ہی شعر و شاعری کا شوق رہا، پھر انتہائی مشق اور ریاضت کے سبب کشمیر کے جانے مانے شاعروں میں شمار ہونے لگے۔ غزل کے فن اور اس کے اصلاحی لوازم کو انھوں نے محنت سے سیکھا اور پھر فنی جھول کے بغیر ان کو برتا۔

ملازمت کے تعلق سے انہیں چھ ماہ کشمیر اور چھ ماہ جموں میں گزارنے پڑتے ہیں۔ اس لئے اُن کی ادبی سرگرمیاں صرف سری نگر تک ہی محدود نہیں ہیں، بلکہ جموں میں بھی وہ "بزمِ فروغِ اردو" کے صدر رہ کر اپنی ادبی انا کو تسکین پہنچاتے ہیں۔

حکیم منظور بہت زود گو ہیں۔ انھوں نے کافی کہا اور خوب کہا ہے بلکہ فن کے

جوہر دکھائے ہیں۔ اپنے پیشے کی غیر معمولی مصروفیت کے باوجود انہوں نے دوسدا بہار شعری مجموعوں کو جنم دیا۔ پہلا مجموعہ " ناتمام " ہے، جو ۱۹۷۷ء میں چھپا اور دوسری شعری تخلیق " لہولمس چنار" ہے، جس کو انہوں نے ۱۹۸۲ء میں شائع کیا۔ یہ دونوں شعری مجموعے بہت ہی گراں قدر اور دیدہ زیب ہیں۔ " ناتمام " کا حرفِ اوّل اردو کے جانے مانے ناقد اور شاعر راج نارائن رازؔ نے لکھا، جب کہ " لہولمس چنار" کا پیش لفظ جناب گوپی چند نارنگ نے تحریر کیا ہے۔ حکیم منظور کے یہ دونوں شعری مجموعے نہ صرف معنوی اعتبار سے بہترین اور کار آمد ہیں، بلکہ اجمالی طور پر بھی دیدہ زیب اور متاثر کُن ہیں۔ " ناتمام " میں غزلوں کی تعداد ۴۷ ہے، جب کہ " لہولمس چنار" میں ۸۲ غزلیں درج ہیں۔ اس کتاب میں درج اشعار کی کل تعداد ۶۴۲ ہے۔

حکیم منظورؔ غزل گو شاعر ہیں۔ اُن کی غزل روایتی نہیں بلکہ انہوں نے نیا آہنگ " نیا ولولہ لے کر اپنا ایک منفرد اسٹائل اپنے ہی لئے ایجاد کیا ہے۔

بقول پروفیسر عبدالقادر سروری:

" اُن کی غزلوں میں موضوعات اور اسلوب دونوں میں روایت پسندی بہت کم ہے۔ یہ نئے عہد کی غزل ہے، جس کا رجحان حقائق اور اخلاقی آدرشوں پر ہے، کچھ اشعار وہ اپنے انداز سے برتتے ہیں۔ ذیل میں دو شعر نقل کئے جاتے ہیں ؎

اب زمانے میں وفا کی کوئی بو باس نہیں
ہم کہاں جاتے ہیں اس کا کوئی احساس نہیں
اور کچھ ہو گا وہ انسان نہیں ہو سکتا!
جس کو انسان کی قدروں کا کوئی پاس نہیں "

(" کشمیر میں اردو " حصّہ سوم۔ صفحہ ۱۴۰)

(۱) ان کی غزل روایتی نہیں ہے، بلکہ روایت سے پھلتی پھولتی ہے۔ حکیم منظور

بنیادی طور پر روایت سے انحراف نہیں کرتے۔

(۲) وہ اپنے اسلوب کو کسی جامد اقدار کے تابع نہیں بناتے۔

(۳) وہ اپنی ترسیل کے لئے ایک نئی راہ اختیار کرتے ہیں۔

(۴) اُن کے اشعار سے سلامت روی مترشح ہے۔

(۵) وہ اپنی معنی آفرینی کو کشمیر کے تلازموں مالا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے اشعار میں مقامیت کی ریل پیل ہے۔

(۶) انہوں نے رعایتِ لفظی کو اپنا شعار نہیں بنایا ہے۔

(۷) وہ لفظوں سے زیادہ افکار کی طرف توجہ دیتے ہیں، جس سے اُنکی غزلوں میں منفرد تخلیقی شان پیدا ہو جاتی ہے۔

(۸) وہ بصارت سے زیادہ بصیرت، علم سے زیادہ تجربے، مطالعے سے زیادہ مشاہدے کے قائل ہیں۔ ان ہی چیزوں سے وہ قاری کو اپنے ساتھ شریکِ افکار کرتے ہیں۔ اور ترسیل کا یہ انداز اُن کے کلام کا وصف بن جاتا ہے۔

(۹) کبھی کبھی وہ تجریدی تمثیل سے بھی کام لیتے ہیں اور یہ انداز اُن کے اسلوب کا حصہ بن جاتا ہے۔

(۱۰) اُن کے کلام میں تہہ داری، گہرائی و گیرائی، معنی خیزی اور جدید حسیّت کے انداز، ایسے تیز و تُند ہتھیار ہیں، جن سے وہ اپنے کلام کو کہیں خنجر کی حلاوت اور کہیں سمندر کی تُندی عطا کرتے ہیں۔

(۱۱) اُن کے یہاں تعقّلی اور فکری انداز ایک نئی جہت لئے ہوئے نظر آتا ہے لیکن اُن کی شعریت فلسفے کی نذر نہیں ہوتی، بلکہ اس میں اعتدال اور غزل کا فطری مزاج مربوط انداز میں سامنے آتا ہے۔

(۱۲) منظورؔ کے کلام میں کہیں کہیں شدّتِ تاثیر کی عظمت اس طرح نظر آتی ہے کہ دل میں ارتعاش اور بے نام سی خلش کا احساس ہوتا ہے اور بقولِ شاعر

ع "کہیں کسی جو ہے سینے میں، غمِ غزل نہ بن جائے" کا خطرہ لگا رہتا ہے۔

(۱۳) وہ کشمیر کو ایک اور رُخ سے دیکھتے ہیں۔ جس میں یہاں کے سفاک موسم اور ان کے بے درد اثرات کے ردِ عمل نظر آتے ہیں۔

(۱۴) ان کے یہاں ایسے اشعار بھی نظر آتے ہیں، جن میں بے تعلق طنزیہ آہنگ دیکھنے کو ملتا ہے اور یہی طنزیت اُن کے کلام کا خاصہ بن جاتی ہے۔

(۱۵) وہ اپنے اشعار سے اعتدال میں لائی ہوئی المیہ کیفیات اس طرح قائم کرتے ہیں کہ اُن کی تاثیر بہت دیر تک ذہن میں قائم رہتی ہے۔

(۱۶) اُن کی شاعری رومانی سے زیادہ حسیاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں جذبات کی شدّت ہوتے ہوئے بھی روایتی مایوسی، دل شکنی، مریضانہ نراجیت، فرار اور شکست کا احساس نہیں ملتا۔

(۱۷) منظور نے استفہامیہ انداز، فعلیہ احساس، جودتِ طبع، اور شعری صلاحیتوں کو اس طرح اپنے شعروں میں سمو دیا ہے کہ اُن کی شاعری میں ایک وقار، ایک ولولہ اور ایک طرحدار شان پیدا ہو گئی۔ اور یہی شان ان کے آنے والے دور میں ایک روشن مستقبل کی نشاندہی کرتی ہے۔

آیئے اب ان عوامل کے انسلاکات پر بھی نظر ڈالیں۔ جن سے وہ نئے معنی تراشنے کی جد و جہد کرتے ہیں:۔

"پتھر" آئینے سے فقط کد ہے کئی لوگوں کو
ورنہ اس شہر کے "پتھر" بھی مثالی ٹھہرے

"موتی" موتی کا کرب موجِ تہہِ آب کی گرفت
خالی صدف بدست شناور اُداس ہے

"رنگ" سات رنگوں کی جبیں پر لکھے گا اپنا نام
جب وہ اپنے رنگ کا عکس آشنا ہو جائیگا

"آنکھ" بے نظر لوگوں کے آگے میں برہنہ ہوں تو کیا
آنکھ والا ہو تو کوئی ڈھونڈے ملبوس میں

جی میں آتا ہے بچا کر آنکھ خود سے ریت پر
دھوپ کھاتی مچھلیوں کا چھپ کے نظّارہ کروں

"بستر"
طوفانِ رنگ کاغذ سادہ قلم قلم !
بھنورے کی آنکھ، پھول کا بستر اداس ہے

ان کے علاوہ "نقش"، "بھنورا"، "ہند کھڑکی"، "شفق"، "شناور"، "پہاڑ"، "برف"
"سنگستان"، "عکس"، "سمندر"، "سورج"، "تیشہ"، "تعبیرِ آئینہ"، "درونِ جسم"، "سراپا جمال"
"میدانِ بے حریف کا لشکر"، "سایہ تراش سورج"، "خوف رُخ دشمنِ جانی"، "لباس معنی
بے لفظ"، "حرفِ بے پیکر" وغیرہ اصلاحات، علامات اور استعارات کی مدد سے حکیم
منظور نے اپنی شاعری میں فکر و معنی کے نت نئے شعری پیکر تراشے ہیں۔

وہ مادرِ وطن کشمیر کی مروّجہ چیزوں سے بھی اسی طرح کھیلتے ہیں کہ ہو بہو وہ
چیزیں نظروں کے سامنے گھومنے لگتی ہیں اور دل میں سما جاتی ہیں۔ اگرچہ اس سمانے
میں جمالیاتی حس کم ہوتی ہے، مگر معنی خیزی کی بھرمار دکھائی دیتی ہے۔ وہ یہاں
کی چیزوں سے پیار کرتے ہیں اور نفرت بھی۔ لیکن اس نفرت میں بھی پیار کی
کی دھیمی دھیمی جھلک محسوس ہوتی ہے :-

"کانگڑی"
کانگڑی بستر میں رکھ کر کھڑکیوں کو وا کروں
برف گرنے کا کبھی میں یوں بھی نظّارہ کروں

"سیب جیسی صورتیں"
لگتے ہیں خوش سب سیب صورت آج بھی منظورؔ
کہ میں اپنے کسی عہدِ شکستہ کا اعادہ ہوں

"پھولوں بھرے رستے"
کتنی خوشبودار ہو گی دھوپ، برف آنکھوں کی ہو گی کتنی نرم
اب جو رستہ آئے گا، کتنا ہے پھولوں بھرا معلوم

استفسارانہ اور استفہامیہ انداز اور لب و لہجہ میں بات کرنا اُن کا خاصہ ہے۔ وہ اُلجھی ہوئی صورتِ حال کو سوچنے اور سُلجھانے کے عمل سے فکری بنا کر اس طرح قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ استفہام گاہے گاہے خود اپنا جواب آپ بن جاتا ہے۔ گویا وہ اَن کہی بات سے ہی جواب اخذ کرتے ہیں اور یہیں پر اُن کا طنز نمودار ہوتا ہے ؎

تری طرح کوئی عکسِ خیال ہوں میں بھی
ہوا جواب دے میرا، سوال ہوں میں بھی

⁂

منظر کُھلا تھا کیسا دریچے کی پشت پر
آوارہ انگ انگ نگاہِ قیاس تھی

⁂

رقم ہوا ہوں یقین و قیاس دونوں میں
کرے تو کیسے کرے میرا تجزیہ کوئی

⁂

چلو! یہ مان لیا بہہ گیا شفق کا لہو!
مگر وہ رنگ جو سوکھے تھے اب ہیں نم کتنے

⁂

ہے آرزو یہی کسی مصنف میں مل سکے
وہ سختیٔ عمل جو مرے قاتلوں میں تھی

⁂

حصارِ ابرِ سیاہ توڑ کے میں آیا ہوں
قبول کر لو مجھے آفتاب جیسا ہوں

⁂

گماں بدوش صفِ دوستاں میں بیٹھا تھا
وہ شخص اس سے زیادہ تباہ کیا ہوتا

⁂

سُوکھا ہے بادل کا سایہ
پانی بھی کتنا پیاسا ہے

⁂

صحیفہ اُن بدن کا بے ورق ہے
بہت محدود ہے معنی کا دامن

⁂

ہاتھ اپنے قلم کروں گا اے اہلِ قلم میں
اک نقش کہ شیشے کا ہے آنکھوں میں رکھو تو

⁂

# پنڈت دینا ناتھ نادمؔ

آپ مارچ سنہ ۱۹۱۶ء میں سرینگر کے متوسط خاندان میں پیدا ہوئے۔ صغیر سنی میں ہی والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ والدہ کی انتھک جدوجہد اور مشقت سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ کالج کی انتہائی تعلیم مشکل سے پوری کی اور محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے مدرسی کے زمانے میں اُردو شعراء کے کلام کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ شعر و سخن سے چوں کہ بچپن سے ہی رغبت تھی۔ اس لئے جلد ہی خود بھی شعر کہنے لگے۔ شروع میں چکبست سے متاثر ہوئے، نظموں میں چکبست کا لہجہ جھلکنے لگا۔ پھر جوش و خروش سے ترقی پسند تحریک میں شامل ہو گئے۔ پہلے نادمؔ کشمیری کے نام سے لکھتے رہے پھر سحر مشرقی کے نام سے بھی بہت کچھ لکھا۔ کشمیر میں اردو شاعری اور ادب کو ترقی پسند تصورات سے روشناس کرانے والے اوّلین ادیبوں میں نادمؔ بھی شامل ہیں۔
نادمؔ آج کل کشمیری کے سربرآوردہ شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن انکی شاعری کا آغاز بھی اردو سے ہوا۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں نادمؔ تحریکِ آزادی میں شامل ہوئے۔ اُن دنوں اِن کا لب و لہجہ صرف سیاسی تھا۔ وہ چونکہ ان دنوں باغی تھے اس لئے اُن کی شاعری بھی عوام کو بھڑکانے اور بغاوت پر اُبھارنے والی تھی۔ نادمؔ کی اِن نظموں پر لاہور کے مشہور "مزدور شاعر" احسان دانش کا بہت اثر تھا۔ اس نظم نگاری کا سلسلہ سنہ ۱۹۴۱ء تک جاری رہا۔ اِسی دوران انھوں نے غزل کی طرف توجہ دی اور کئی اچھی غزلیں کہیں۔ غزل عموماً وہ سحر مشرقی کے نام سے لکھتے تھے۔
نادمؔ کی شاعری میں کلاسیکی رنگ بھی ہے اور رومانی مزاج بھی، وہ ترقی پسند بھی ہیں اور دردوں بین بھی۔ لیکن ان کے یہاں جدیدیت کی آنچ اتنی مدھم ہے کہ اس کی حلاوت کا احساس جلدی ہی نہیں ہو پاتا۔ آیئے اُن کی ہے جہت شاعری کے چند رنگ دیکھیں

سرمستی وسرشاری اور تاثیرو دل فگاری غزل سے یوں عیاں ہے ۔

(۱)

اسیرِ عشق ہوا ، آبرو کی خاک اُڑی
زباں پہ حرفِ وفا صورتِ سوال آیا

(۲)

کھلی رہے گی پسِ مرگ چشمِ تر میری
کہ وا رہیں درِ دل تیرے آنے جانے کو

(۳)

مجھے تمہارا تصوّر ، تمہیں خیالِ رقیب
میں یاد آنے کو روؤں کہ بھول جانے کو

(۴)

سحر تو فکرِ عمل سے جو بے نیاز ہوا
زیاں و سود کو دریا میں جا کے ڈال دیا

⁂

رات کا پچھلا پہر تارے ہوئے ہیں محوِ خواب
دامن بادل میں جا کر سو چکا ہے آفتاب

پھر رہے ہیں چار سُو مایوس ٹکڑے ابر کے
گھاٹیوں میں کنگروں پر اونگھتے ہیں دُھندلکے

ایک ٹوٹا جھونپڑا محزوں سا ویرانی میں ہے
شب کا سایہ صبح کے بہتے ہوئے پانی میں ہے

(ایک نظم کے چند اشعار)

نادم پہلے اُردو میں کہتے تھے ۔ مہجور سے ملاقات کے بعد انھوں نے کشمیری میں کہنا شروع کیا ۔ اس طرح ایک ذہین ، زود فہم ، سخن شناس اور سخن سنج اُردو شاعر اُردو سے ہمیشہ کے لئے دور ہو گیا اور کشمیری کا شاعر ہو کر رہ گیا ۔ اُن کی ادبی خدمات کے عوض انھیں کئی قومی اور بین الاقوامی انعامات اور اعزازات سے بھی نوازا گیا ۔

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد للہ دید ہائر سیکنڈری اسکول کے اعزازی صدر کی حیثیت سے آج کل اپنی "جیون نیا" چلا رہے ہیں ۔

⁂

# قیصر قلندر

اِن کے اب تک دو شعری مجموعے (۱) "سازِ جمال"۔ (۲) "سازِ آرزو" شائع ہو چکے ہیں
ایک عرصہ تک آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہنے کے بعد اب اپنے فرائض سے
سبکدوش ہو گئے ہیں۔ لیکن اُن کا تخلیقی سفر اب بھی پورے زور و شور سے جاری ہے۔
قیصر قلندر کشمیر کے ان اُردو شاعروں میں سے ایک ہیں، جنہوں نے کم و بیش اُردو
شاعری کے تمام رجحانات کو دیکھا اور برتا ہے۔ قیصر قلندر کا اسلوب جدید ہے، لیکن
اُن کی جدت پسندی میں اُردو کی کلاسیکی شاعری کی آنچ بھی موجود ہے۔ اسی لئے
اُن کی شاعری ہر حلقے میں پسند کی جاتی ہے۔ قیصر قلندر کی شاعری کے مختلف
رنگوں کا اندازہ اُن کے درجِ ذیل اشعار سے لگایا جا سکتا ہے ؎

جب درد کی شمعیں جلتی ہیں احساس کے نازک سینے میں
اِک حسن سا شامل ہوتا ہے پھر تنہا تنہا جینے میں
آغوشِ تمنا چھو آئیں جب زُلفِ یار کی خوشبوئیں!
آنکھوں میں ساون لہرایا، دیپک سے سُلگے سینے میں
پلکوں کے سُلگتے تاروں سے میں رات کی افشاں لا نہ سکا
شعلوں کو چھپائے پھرتا ہوں، میں دل کے ایک نگینے میں
یہ رنگِ حیا، احساسِ طرب، آئینہ رُخ میں عکس فگن
اِک تابش تیرے چہرے کی، اِک آنچ سی میرے سینے میں

ایک اور غزل کے چند اشعار ؎

پھول سی باتوں کا چلتا ہے ہمیشہ جادو نیم خواب آنکھوں میں پلتا ہے ہمیشہ جادو

جیسے احساس کی رگ رگ سے شرارے ٹپکیں
یاد کی آگ سے جلتا ہے ہمیشہ جادو
جلگتے لمحوں میں تلخابۂ شیریں کے سبو
رات کا دل بھی نگلتا ہے ہمیشہ جادو
زُلف کے ساتھ مہکتا رہا افسونِ غزل
شعرِ قیصر سے سنبھلتا ہے ہمیشہ جادو

نظم میں حفیظ جالندھری کا انداز :-

حیات نغمہ زار ہے، خیال زر نگار ہے
برس رہی ہیں مستیاں فضا پہ اک خمار ہے
چمن چمن گلوں کی آگ کتنی خوشگوار ہے
رباب چنگ بیچ ہیں، سرودِ آبشار ہے

نظم میں کلاسیکی انداز سے

گھٹا اس کاکلِ پُرپیچ کی برسات لے آئی
عروسِ شعر و نغمہ ساتھ اپنے رات لے آئی

اُس کے جلو میں :-

گداز نیم شب آہوں کے نغمے، بربطِ انجم
صبا کا لوچ، غنچوں کا تبسم، بادۂ شبنم
مئے افکار و بزمِ ماہ و مینائے غزل لائی
لبوں کے احمریں مصرعے دل آرائے غزل لائی

جدید انداز کی نظم "لال چوک" (جو ہمارا ادب ۶۲-۶۳ء میں شائع ہوئی)

زندگی مدتوں سے رہی مضطرب
پردۂ ساز میں جیسے نغموں کے دل
وقت کے جسم ہی میں دھڑکتے رہے
سخت حالات اور نرم لمحوں کے دل
گیسوِ گُل کی خوشبو پریشاں رہی
اور پتنگے جلے، جیسے شمعوں کے دل

ایک اور نظم کے چند اشعار :-

سازِ ایام اُٹھاؤ کہ سنیں گے نغمۂ گُل
عمرِ رفتہ کو ذرا لاؤ کہ ہم آئے ہیں
چار سُو جلوۂ معبود کی رعنائی ہے
عشق کی گرمی و تندی سے ہوا ہے ظاہر
خود ہی شاہد ہے وہ معبود کہ عبد اور معبود
گلشنِ خواجہ بطلہ سے کئی گُل پھوٹے
کوہِ ماراں بگہر لعلِ بدخشاں دارد
ایں چنیں بحث کجا تختِ سلیماں دارد

- :.: -

# پنڈت دینا ناتھ چکن مست

آپ کشمیر کے ایک کہنہ مشق سخن سنج ہیں۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں اسلام آباد (کشمیر) میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد پنڈت آنند چکن مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے پرائیویٹ سیکریٹری رہ چکے ہیں۔ مست نے اپنی تعلیم میٹرک تک سرینگر میں حاصل کی۔ لاہور کے رسالہ "صبح کشمیر" کے مدیر رہے۔ لاہور سے لوٹنے کے بعد امریکن ایمبیسی میں ملازم ہو گئے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں پنڈت کیفی سے تعارف ہوا اور ان کی کاوشوں سے شعر وشاعری کے میدان میں کود پڑے۔ پہل غزل سے کی، پھر نظم کی طرف مڑ گئے۔ مشقِ سخن جاری رکھی اور اچھے شاعروں میں شمار ہونے لگے۔ مست کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جذبات سے بھرپور ہیں۔ مست کی غزل رومانی ہے، نظم میں منظر کشی اور شمالی "کشمیری پن" سے وہ انفرادیت پیدا کرتے ہیں۔ مست نے قومی اور وطنی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ سماجی شعور مست کی نظموں کی ایک اہم خصوصیت ہے :-

بہت صدمے سہا کرتا ہوں میں تیری محبت میں

رہینِ گریۂ پیہم رہا کرتا ہوں خلوت میں

چراغِ برق کی صورت دھنواں اٹھتا نہیں لیکن

سراپا داغِ دل سے جل اٹھا ہیں سوزِ الفت میں

تری مُرلی کا نغمہ گونجتا رہتا ہے کانوں میں

نظر آتا ہے تیرا روپ اب ہر ایک صورت میں

ایک اور غزل کے چند اشعار :-

کیوں کسی کے لئے تو روتا ہے ۔ ہار موتی کے کیوں پروتا ہے

یاس و حرماں، جنون و رسوائی ۔ عشق میں بس یہی تو ہوتا ہے

مست سمجھا ہے زندگی جس کو ! موت اُس کا مآل ہوتا ہے

چکبست کو خراجِ عقیدت :-

آہ ! اے چکبست اے روحِ روانِ شاعری ہو گیا خاموش تو اے نغمہ خوانِ شاعری
خوگرِ حبِ وطن تھا، عاشقِ زارِ چمن تیرے شعرِ تر سے تھا سرسبز گلزارِ وطن

⁘

کوئی سما سکے گا کیا دیر و حرم کی قید میں ٹھہرے جو لامکاں کوئی اس کا ہو کیوں مکاں الگ

⁘

## ایرج کاشمیری

مظفر ایرج کاشمیری سنہ ۱۹۴۴ء میں سرینگر کے محلہ صفاکدل میں پیدا ہوئے۔ یہیں تعلیم پائی اور ہینڈ لوم تیکنالوجی میں ڈپلوما حاصل کر کے جموں و کشمیر انڈسٹریز میں ملازم ہوئے۔ شعر و سخن کا فطری ذوق تھا۔ چنانچہ ملازمت کی غیر شاعرانہ فضا میں بھی اپنے ذوق کی پرورش میں مصروف ہیں۔ جدید غزل گو ہیں۔ رمزیہ علامات، قافیوں کی نیرنگی، موضوعات اور اسلوب کا نیاپن انھیں کشمیر کے جدید غزل گو شعراء میں ایک ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ غزل کے علاوہ نئی نظم بھی لکھتے ہیں۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :-

اس عالمِ نفسا نفسی میں ہم چاک گریباں کیا ڈھونڈیں
آدابِ سخن معلوم نہیں، اندازِ سخنداں کیا ڈھونڈیں

اک دورِ تلاطم ہے برپا، جذبات کے گوشے گوشے میں !
کیوں ہنگاموں کی فکر کریں اور شورشِ زنداں کیا ڈھونڈیں

⁘

اے دوست ! محبت میں تاثیر عجب دیکھی ہم دور ہیں منزل سے اور سامنے منزل ہے

⁘

نقشِ کہن مٹائیں گے آج نہیں تو کل سہی جوت نئی جلائیں گے آج نہیں تو کل سہی
جوشِ جنوں ہیں دوستو اپنی ہی وحشتوں سے ہم عمر کچھ اور بڑھائیں گے آج نہیں تو کل سہی

# غلام محمد میر طاؤس

آپ پانپور کاشمیر میں ۲۲ مئی ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوئے۔ پانپور، کشت زعفران کی بدولت دُنیا بھر میں مشہور ہے۔ طاؤس صاحب کے والد کا نام حاجی سیف اللہ تھا۔ جو اپنے وقت کے اچھے شاعر اور نثر نگار تھے۔ طاؤس نے ابتدا میں اپنے والد سے ہی فن شعر و سخن سیکھا اور کالج کے زمانے میں ان کی شاعری میں نکھار آیا۔ اور وہ اپنے والد سے بھی آگے نکل گئے۔ ۳۸ء تک طاؤس اچھے خاصے شاعر بن چکے تھے۔ طاؤس صاحب غ۔م۔ طاؤس کے نام سے ادبی دنیا میں جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے نئے عہد کے تقاضوں اور ادبی معیاروں کو بڑی خوبی سے اپنے تخلیقی سفر میں جذب کیا۔ وہ کشمیر کی ادبی دُنیا میں ثاقب کی طرح عیاں ہوئے۔ ایک طرف ملازمت کی ذمہ داریوں کو نبھاتے رہے اور دوسری طرف شعر و ادب کی تخلیق بھی کرتے رہے۔ گھر کے ادبی ماحول نے ان کو لکھنے پر آمادہ کیا تھا اور انھوں نے اس چیلنج کو نہ صرف پایۂ تکمیل تک پہنچایا، بلکہ اس میں نئی جہتیں اور نئے اضافے بھی کئے۔

اُن کا ادبی سفر رسالہ "پرتاپ" سے شروع ہوا۔ پھر ملک کے دوسرے مقتدر رسالوں میں بھی شائع ہونے لگے۔ "پرتاپ" کے ایڈیٹر بھی چُنے گئے۔ علی گڑھ سے ایم۔ اے ایل۔ ایل بی کے امتحانات پاس کئے۔ ۴۴ء میں سرکاری ملازم ہوتے اور اپنی ذہانت کی بدولت محکمۂ امور خارجہ کے سکریٹری کے عہدے تک پہنچے۔ اب وظیفہ حسن خدمت پر ہیں۔

طاؤس نے اپنا شعری سفر غزل شروع کیا۔ لیکن غزل میں وہ محض روایت پسندی کے مقلد نہ رہے بلکہ انھوں نے نئے عہد کے شعور اور نئی تحریکوں کے اثر سے اپنی غزل

کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ اُن کی غزلوں میں تجربات اور مشاہدات بدرجۂ اتم نظر آتے ہیں۔ پھر حالات نے انہیں نظم کی طرف مائل کر دیا۔ لیکن انھوں نے نظم میں بھی اپنے تجربوں سے ایک انفرادی چمک پیدا کی۔ وہ شروع میں اقبالؔ اور حفیظؔ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ پھر تجربے کی بالغ نظری نے انہیں غالبؔ کا گرویدہ بنا دیا۔ چنانچہ غالب کی مشہور زمین میں انھوں نے ایک نظم لکھی ؎

زندگانی میں میسّر ہو مجھے دل کا سکوں
موت آجائے تو مر کر نوحہ خواں کوئی نہ ہو

دیارِ مغرب کے تہذیب و تمدّن کا یوں مضحکہ اُڑاتے ہیں:۔

وہ جس کی خام کاری کو نئی ترکیب کہتے تھے
جسے اہلِ جہاں سرچشمۂ تہذیب کہتے تھے
وہی قومیں معاذاللہ! باہم دست و گریباں ہیں
اُخوت اور آزادی پہ کہتے تھے جو قرباں ہیں
وہ رو رو رہے ہیں آج اپنی نارسائی کا
جنہیں دعویٰ تھا دنیا بھر میں اپنی رہنمائی کا

بھلا تہذیبِ حاضر کا یہی انجام ہونا تھا
ہزاروں بے گناہ لوگوں کا قتلِ عام ہونا تھا

انھوں نے غالبؔ کی طرح نامساعد حالات میں بھی زندگی قدر جانی ہے ؎

نغمہ ہائے غم کو بھی، اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

طاؤسؔ کی نظموں میں ہمیں جیتا جاگتا انسان نظر آتا ہے۔ وہ اس کے غم اور اس کی خوشی میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ وہ حقیقت پرست اہلِ نظر کی طرح زندگی اور اس کے جملہ نارسائی کے مناظر اس طرح بیان کرتے ہیں کہ مظلومی، ناداری، بے کسی اور بے بسی کی تصویر ہو بہو آنکھوں کے سامنے آتی ہے۔ وہ زندگی کے روشن پہلوؤں سے آنکھیں نہیں چراتے بلکہ خوشی کو قدرت کی ایک نعمت جان کر یوں فرماتے ہیں ؎

قسم اس آہ کی جو رات کی گہری خموشی میں
کسی مظلوم کے مجروح سینے سے نکلتی ہے

قسم اُس قوم جو آفتوں، صدموں کے نرغے میں
یکایک اُٹھ کے گرتی ہے مگر گر کر سنبھلتی ہے

مجھے اس خاکداں سے پھر بھی بے پایاں محبت ہے،
یہ جینا کچھ بھی ہو لیکن مجھے جینے سے اُلفت ہے،

طاؤس کو وطنی نظمیں لکھنے کا بے حد شوق ہے۔ اپنی جنم بھومی پانپور کے زعفران زاروں کا وہ بڑی دلکشی سے ذکر کرتے ہیں۔ اِس سلسلے میں اُن کی نظم "چندن ہار" نمونے کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے۔ اس نظم کا مرکزی کردار "حبہ خاتون" ہے۔

اِن ٹیڑھے ترچھے کھیتوں پر جب حسنِ بہاراں مچلا تھا
اِس گیلی پیلی مٹی نے اک شوخ شرارہ اُگلا تھا
جب آنگن میں اک کٹیا کے اک شہ کا پاؤں پھسلا تھا
اک درد کا لاوا اُبلا تھا، اک نورِ مجسم پگھلا تھا

طاؤس کا لہجہ نرم، اسلوب دلنواز اور چھوٹی بحروں کا استعمال ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ غزل میں تیکھا انداز دیکھئے :-

آ۔ کہ بہار آگئی پھول کھلے ہیں سو بہ سو ۔۔۔ دیکھ یہ بوستانِ رنگ، دیکھ یہ گلستانِ بو
میں ہوں ایک تشنہ کام، محفلِ انبساط میں ۔۔۔ مضطرب و شکستہ جام منتظر و تہی سبو
آ۔ کہ تیرے بغیر ہے میرا شباب سوگوار ۔۔۔ تیرے بغیر نوحہ خواں کشتِ گل و کنارِ جو

غرض کہ طاؤس کے یہاں کلاسیکی آہنگ بھی ہے اور ترقی پسندی کی آنچ بھی۔ وہ کبھی کبھی "دروں بینی" پر بھی مجبور نظر آتے ہیں۔ وہ روایت پسند بھی ہیں اور اس کے باغی بھی۔ بالفاظِ دیگر وہ وقت کے بہاؤ کے ساتھ بہتے ہیں اور وقت کے تقاضوں اور ضرورتوں کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ اُن کا مجموعۂ کلام سنہ ۱۹۸۲ء میں "موج موج" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

— ⁘ —

# سیف الدین سیفی

آپ ۱۹۲۲ء میں کشمیر کے مشہور قصبہ سوپور میں تولد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد مولوی غلام رسول سے پائی۔ عربی و فارسی کے امتحانات امرتسر سے کامیاب کئے۔ محکمہ تعلیم میں مدرسی سے لے کر تحصیل ایجوکیشن آفیسر کے عہدے تک پہونچے۔ اُن کا تعلق مولانا محمد انور شاہ (جید عالم دین اور مسلم مفکر) کے خاندانِ رشد و ہدایت سے ہے۔ سیفی نے مذہبی و علمی ماحول میں آنکھ کھولی۔ مذہب سے فیض و برکت اور روحانی تسکین پائی اور علم سے ذہنی و فکری روشنی۔ ان دونوں چیزوں کو کثرت سے استعمال کیا۔ شعر و سخن کا سفر میٹرک سے شروع کیا۔ اور آج اپنی کبیر سنی میں بھی اس سفر کو زور و شور سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری کی عمر تقریباً چالیس سال ہے۔ اس طویل مدت میں انہوں نے اپنی اَن تھک محنت اور ریاضت سے شاعری کے جملہ رموز و نکات کو سمجھا اور برتا ہے۔

سیفی کشمیر کے صاحبِ فکر و فن شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کی شروعات رواج کے مطابق غزل سے کی ہے۔ لیکن تجربے اور شوقِ تجسس نے اُنہیں نظم لکھنے پر مجبور کر دیا۔ اُن کی نظمیں زمانے کے تقاضوں کو نہ صرف پورا کرتی ہیں، بلکہ نظم میں نئی وسعتیں اور جہتیں بھی پیدا کرتی ہیں۔ اُن کی غزلیں فنی کاری اور رموز و نکات سے مزین ہیں اور وہ

اساتذہ کی طرح پختہ غزل کہتے ہیں۔ غزل کے موضوعات کو کامیابی سے برتنا آپ کا محبوب مشغلہ ہے ۔ وہ غزل کے رنگ اور آہنگ کو ہر صورت میں قائم رکھتے ہیں۔ اُن کا فن کلاسیکی لوچ اور ترقی پسندی کی مقصدیت لئے ہوئے نظر آیا ہے۔ آیئے ! اُن کی غزل کے چند شعر دیکھیں :۔ ؎

خامشی میری بہ انداز فغاں ہے کہ نہیں
دل کی ہر بات نگاہوں سے عیاں ہے کہ نہیں

تیرے ہونٹوں پہ تبسم کی دمکتی تحریر
ایک مُنہ بولتا منشورِ اماں ہے کہ نہیں

پھونک ڈالا تھا کبھی جس نے مرے دل کا سکوں
اب وہ آتش بہ جگر شعلہ بجاں ہے کہ نہیں

چھوٹی بحر وں میں رواں اشعار :۔

جن پر فدا ہوں آسماں کے ستارے
نظر میں کچھ ایسے بھی ہیں ماہ پارے
ہے سرمایۂ زندگی یاد اُن کی !
جو لمحے ترے ساتھ ہم نے گزارے

سیفی کی نظم "مسافر" کی ایک جھلک :۔

وہ دیکھئے شام ہو چکی ہے
غروب کے بعد سحر کی وادی میں چپکے چپکے سیاہیٔ شب اُتر رہی ہے
جو نغمے تھے خاموش ہو گئے ہیں
ہوا بھی ساکت ہے جیسے تھک کر ٹھہر گئی ہو۔

—— ⁘ ——

# بشارت سلیم

آپ کی پیدائش ۱۴ اگست ۱۹۳۱ء کو سرینگر میں ہوئی اور آپ کی ادبی زندگی کا آغاز آپ کے ہوش سنبھالنے کے ساتھ ہی ہوا۔ آپ کے والد مرحوم صاحبزادہ غلام محی الدین خان جو اعلیٰ سرکاری منصبوں پر فائز رہے۔ اُردو، انگریزی، فارسی اور عربی کے ایک جیّد عالم ہونے کے علاوہ ایک ایسے عالی مرتبت خدارسیدہ بزرگ بھی تھے، جن میں روحانیت میں ڈھلا ہوا آب و تاب گوہر موجود تھا۔ آپکی پیدائش جس گھرانے میں ہوئی وہ ہمیشہ علم و ادب، عرفان اور سیاست کا گہوارہ رہا ہے۔ جہاں اخلاقیات اور ایک ربطِ خاص کا دور دورہ تھا۔ عام طور پر خوشحال گھرانوں کے بچّوں کے شب و روز کھلونوں اور دل بہلاوے کی بھول بھلیوں کے سہارے گذر جاتے ہیں۔ لیکن آپ کی کیفیت سراسر مختلف تھی۔ بقول بشارت سلیم صاحب :۔

"اپنے بازو گھر میں چاہے جس سمت بھی پھیلاتا۔ میرے ہاتھ میں کوئی کتاب ہی آتی، کوئی رسالہ کوئی میگزین یا کوئی اخبار ہی آتا۔ مجھے اب بھی یاد ہے "پیسہ" اخبار سے لے کر "زمیندار" تک اور "الہلال" سے کر "نیرنگِ خیال" اور "مخزن" تک ان گنت اخبار اور رسائل کے علاوہ قائدِ اعظم مرحوم کے اخبار "نیوٹائمز" سے لیکر "سول اینڈ ملٹری گزٹ" تک کئی انگریزی اخبار اور غیر ملکی میگزین باقاعدگی کے ساتھ والد مرحوم کے نام آتے۔ والد مرحوم چونکہ ماہر اقبالیات بھی تھے اس لئے اقبال مرحوم کی کتابیں میرے گرد و پیش رہتیں۔ علم و ادب کی دلچسپی میرے نفس نفس میں سما گئی۔ میرے ذوقِ لطیف کی آبیاری ہوتی رہی اور ذہن میں نقوشِ سیمیں اُبھرتے گئے اس طرح پڑھنے لکھنے کا آسودہ شوق مجھے ورثے میں ملا ہے۔"[1]

---

[1] بشارت صاحب نے راقم سے ایک انٹرویو کے دوران ان باتوں کا انکشاف کیا تھا۔

آپ کی سنجیدہ ادبی زندگی کا آغاز اس وقت ہوا۔جب آپ نے میٹرک کا امتحان پاس کرکے سرینگر کے ایس۔پی کالج میں داخلہ لیا۔شروع میں آپ نے افسانہ نگاری کی اور پھر شاعری۔"حلقۂ شعروادب" کے جنرل سکریٹری بھی رہے۔میگزین "لالہ رُخ" کے ایڈیٹر بھی مقرر ہوئے۔آپ کا "ہمایوں"۔"بیسویں صدی"۔"ادبِ لطیف"۔"نگارش"۔"شاہکار"۔"عزائم" لکھنؤ۔"نئی دنیا" (کامٹی) "ہمارا ادب" (سرینگر) وغیرہ اور مقامی اخبارات میں چھپتا رہا۔ریڈیو اور دوردرشن کی وساطت سے بھی ان کا کلام منظرِعام پر آتا رہتا ہے۔آج کل آپ شعروشاعری کے ذوق کو تسکین پہنچانے کے ساتھ ساتھ آل انڈیا لٹریری کانفرنس کے ریاستی صدر بھی ہیں۔

اقبالؔ نے اُنہیں انتہائی متاثر کیا ہے۔اس کا عکس آپ کی ۱۹۵۹ء میں لکھی ہوئی نظم "تازیانہ" کے ان اشعار سے لگایا جاسکتا ہے:۔

فلک پر رات تاروں میں ہوئیں سرگوشیاں جیسی
زمیں پر آدمِ خاکی کی تقدیریں بدلتی ہیں
گماں تھا اُس کی قسمت پر ہمیشہ ہم مسلّط تھے
ہمیں محکوم کرنے کی تمنّائیں مچلتی ہیں
گوارا کی نہ تھی ابلیس نے جس کی جبیں سائی
زمیں وآسماں کی رفعتیں قدموں میں پلتی ہیں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی شاعری پر پانچویں دہائی کے اواخر تک پنجاب کے حلقۂ شعراء خاص طور پر حفیظ جالندھری، جوش اور ماہر القادری کی ہلکی پھلکی نظموں کا گہرا اثر رہا۔چنانچہ اس دوران جو نظمیں لکھی ہیں ان میں رواں بحر اور لفظی ترنم پر زیادہ زور ملتا ہے۔اسی زمانے کی لکھی ہوئی نظم کے چند اشعار:۔

پھر اُبھرتے جارہے ہیں ذہن میں تیرے نقوش
تھامتا ہوں تیری دھن میں آج پھر جام وسبو

اِک خلش بے نام سی ہے، اِک تمنّا لازوال
ہائے کتنا دل نشیں ہے امتزاج رنگ و بو
آج کیوں انسانیت تذلیل سے دوچار ہے
جس کی تقدیس و تفخر تھے ہمیشہ ارجمند
اِک سکونِ قلب کی دُھن کیوں ہراساں ہی رہے
پھینکتی ہے آج پھر یہ چاند تاروں پر کمند
آدم و حوّا کی بیٹی آج کیوں مایوس ہے
روئے گیتی پر نمایاں جیسے ہو مکروہ داغ

بشارت سلیم کی غزل اگرچہ روایتی نہیں ہے، مگر اس میں رومانی فضا اور کلاسیکی آہنگ ضرور ملتا ہے، کہیں کہیں رومانی فضا میں بھی نئے اندازِ فکر اور اسالیب کے اثرات ملتے ہیں۔ وہ غزل کو مخصوص ترقی پسند تصوّرات سے بھی سجاتے ہیں ؎

ایک غزل کے چند اشعار :-

عجیب دستورِ گلستاں ہے کہ اس طرح سے بہار آئے
کسی کے حصّے میں پھول آئے، کسی کے حصّے میں خار آئے

نہ جانے خود کو کہاں یہ ہم نے کیا ہے گم اب یہ کس سے پوچھیں
اُنہیں تو شہروں میں دشت و صحرا میں ہر طرف ہم پکار آئے

تمہارے وعدوں کی دلکشی میں، تمہاری یادوں کی روشنی میں
وہ رات جو انتظار کی تھی وہ رات بھی ہم گزار آئے

(یہ غزل شاعر نے عرشؔ ملسیانی کی صدارت میں منعقدہ ایک مشاعرہ میں سنائی تھی)۔

غزل میں کلاسیکی روایت پسندی اور رومانی شاعری کا سنگم :-

تمہارے اندازِ دلربائی نے لاج رکھدی صنم کدہ کی
یہی وہ اندازِ دلبری ہے صنم جو کعبے میں بھی سجادے

جو تیری محفل میں تشنہ آیا، وہ مست اُٹھا، خراب اٹھا
جو تیری محفل سے مست اُٹھے کہاں وہ جائے تو ہی بتا دے
مجھ ہی سے آباد میکدہ ہے، مرے خدا مجھ کو یاد رکھنا
لٹا رہا ہوں میں زندگی کو، تو اپنی رحمت کو بھی لٹا دے

(یہ غزل شاعر نے مرحوم سجاد ظہیر کی صدارت میں منعقدہ ایک مشاعرے میں سنائی تھی)۔

— :: —

# تنہا انصاری

آپ کا پورا نام حسین علی انصاری تھا۔ آپ کے والد ریاست کے سربرآوردہ اساتذہ میں شمار ہوتے تھے اور وہ فارسی و عربی کے جید عالم تھے۔ تنہا کو شعر و شاعری سے لگاؤ تھا۔ اُن کے شوق کو دیکھ کر ان کے والد نے اُن کی رہنمائی کی۔ تنہا نے کشمیر میں بی اے۔ اور بی۔ ایڈ کے امتحانات امتیاز کے ساتھ کامیاب کئے اور اپنے والد کی طرح محکمۂ تعلیم میں بحیثیت مدرس داخل ہوئے۔ ماحول شعر و سخن کا تھا، اس لئے جلد ہی شاعر ہو گئے۔ ابتدا میں مروجہ روایت کے مطابق غزل گو بن گئے۔ پھر نظموں کی طرف راغب ہوتے اور پھر وسیع اصناف میں مختلف گوناگوں موضوعات پر طبع آزمائی کی۔ غزل اور نظم میں انھیں اونچا مقام حاصل تھا۔ کلاسیکی انداز میں مرثیہ لکھنے والے ریاستِ جموں و کشمیر کے واحد سربلند شاعر مانے جاتے ہیں۔ اقبال کے شیدائی تھے، اِس لئے اُن کی نظموں میں عموماً اقبال کا اسٹائل نظر آتا ہے۔ تنہا کی فکر کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں اپنے عہد کی ساری تحریکیں سمٹ آتی ہیں۔ جدید ادبی رجحان کے زیرِ اثر بہت سی غزلیں تنہا نے ایسی بھی لکھی ہیں، جن میں فکر کا پورا تسلسل نہیں، آہنگ کا تسلسل ملتا ہے، نظموں میں مناظر فطرت، سماجی و سیاسی مسائل، مذہبی خیالات اور مسائل کو بھی جگہ دی ہے۔

ترتیب اور تجربوں کے اثرات بھی ملتے ہیں۔

غزل کے چند اشعار پیش ہیں ؎

سمجھ کر بادۂ گلرنگ پی لیتا ہوں خونِ دل
زباں خاموش، زخموں سے جگر گلپوش ہے ساقی
تھے وہ بھی دن کہ اپنے دل میں ہنگامے مچلتے تھے
ہوئی مدت کہ یہ کمبخت بھی خاموش ہے ساقی
وہاں خُم اور یہاں قطرے، ترا انصاف بھی دیکھا
یہ پامالِ ستم تنہا تو دریا نوش ہے ساقی

ایک اور غزل کے چند اشعار :- (جو فکر اور اسلوب کے لحاظ سے قابل قدر ہیں)۔

خُدا کے حوالے سدھارو، سدھارو — مری آرزوؤں کی رنگیں بہارو
نہ گھیرو، تصوّر پہ شب خوں نہ مارو — مچلتے ہوئے آنچلوں کے کنارو
حماقت ہے اب ذکرِ رُخسار و گیسو — طلسمِ محبّت کے پروردگارو
تلاشِ نظر، اک فریبِ نظر ہے — نظر کی نوازش کے امیدوارو

نظم میں منظر نگاری، ذاتی مشاہدات اور اندازِ بیان کی انفرادیت کے ساتھ:-

اُف وہ تابندہ جبیں لمحے، نظر افروز رات
وہ سکوں پرور رُدمان وہ تغیّر بے ثبات
جیسے زد پر حُسن کی آکر رُکی تھی کائنات
ہائے وہ اعجازِ منظر، نغمہ بن جاتی تھی بات

⁖

میکدہ بر دوش وہ معصوم سیلِ رنگ و بو
دفعتاً چھلکا دیا تھا جس نے جامِ آرزو

⁖

پھر کہیں سے آج بوئے زلفِ یار آئی ہے دوست — بہکی بہکی سی ہوا دیوانہ وار آئی ہے دوست

دعوتِ دیوانگی لے کر بہار آئی ہے دوست  پھر مری دنیا میں دنیائے شرار آئی ہے دوست
ایسا کچھ محسوس ہوتا ہے بہار آئی ہے دوست

اقبال کا اندازِ فکر اور جوش کا آہنگ لئے مرثیہ :-

کمر بستہ ہیں، سرگرمِ عمل ابلیس کے چیلے
جہاں میں نقشِ یزداں قلبِ انساں سے مٹانے کو
نظامِ اہرمن چالاک ہے صورت بدلنے میں
تپاں ہے روحِ چنگیزی یہاں قالب میں آنے کو
کہو شبیرؑ سے میداں میں پھر للکارتا نکلے!
یزیدِ عصر ہے تیار خنجر آزمانے کو
یزیدیت، قبا جمہوریت کی زیبِ تن کرکے
اٹھی نازو ادا سے پھر نیا اک گل کھلانے کو

تنہاؔ بارہ مولہ کے قصبہ دلنہ میں سنہ ۱۹۲۰ء میں تولد ہوئے۔ اور ان کی وفات
سنہ ء میں ہوئی۔

— :: —

# اکبرؔ جے پوری

آپ جے پور میں سنہ ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے۔ اسلاف کشمیر تھے، جو بسلسلۂ ملازمت
جے پور میں مقیم تھے، وہیں اکبرؔ نے تعلیم پائی۔ شعر و سخن سے لگاؤ پیدا ہوا اور
سید معشوق حسین اطہر سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ تقریباً تیس ۳۰ سالوں سے شعر و
ادب میں طالع آزمائی کر رہے ہیں۔ بسیار گو ہیں اور شاعری کے رموز و نکات
سے واقف ہیں۔ غزل اچھی کہتے ہیں، اپنے زمانے کے واقعات پر کئی نظمیں بھی
لکھی ہیں۔ سنہ ۱۹۴۰ء سے سرزمینِ کشمیر کے شعر و ادب کی آبیاری کر رہے ہیں، لکھنوی

انداز میں غزل کہنا اُن کا انفرادی چلن ہے۔ پھر بھی عصری تحریکوں کا رنگ و آہنگ اُن کے یہاں کہیں نہ کہیں نمایاں ہو ہی جاتا ہے:۔

ہنسی گلوں کی خزاں کو قریب لائی ہے سلیقہ چاہئے اے دوست مسکرانے کا

⁘

ہر شام کے پردے میں ہوتی ہے سحر پنہاں مرنا بھی حقیقت میں جینے کا بہانہ ہے

⁘

ہر طرف پھیلا ہوا ہے حسن کا دام فریب پاؤں اس وادی میں رکھنا دیکھ اے دل دیکھکر

نظم "جنتِ کاشمر کی ایک جھلک":۔

رد کشِ انہار فردوس ابشارِ کاشمر نازشِ گلزارِ جنت لالہ زارِ کاشمر

نخلِ طوبیٰ پست از شاخ چنارِ کاشمر فرع سدرہ شرمگیں از برگ و بارِ کاشمر

سرنگوں نہ آسماں از گلستانِ کاشمر حوضِ کوثر آب آب از رود بارِ کاشمر

⁘

اکبرؔ نے مرثیہ کے انداز میں بہت اچھی نظمیں بھی کہی ہیں۔ ان کا کلام ۶۵ء میں "سازِ شکستہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

— ⁘ —

## عبدالرحمن راہی

راہی ۱۹۲۵ء میں سرینگر کے ایک متوسط خاندان میں پیدا ہوئے۔ سرینگر میں ہی فارسی اور انگریزی میں ایم۔ اے کیا۔ روزنامہ "خدمت" کی ادارت میں شامل ہوئے۔ نوجوانی ہی سے شعر و شاعری محبوب مشغلہ رہا۔ اور یونیورسٹی تک آتے آتے یہ مشغلہ کافی تنومند ہو گیا۔ اپنی ذہانت سے وہ کشمیری کے بالخصوص اور اُردو کے بالعموم سر دلعزیز شاعر ہو گئے۔ حال ہی میں یونیورسٹی آف کشمیر کے شعبۂ کشمیری کے

ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ راہی بیک وقت شاعر و ادیب بھی ہیں اور نقاد بھی۔ تینوں شعبوں میں ان کا کام اتنا ہے کہ اس مقالے میں طوالت کے خوف سے اُس کا ذکر کرنا ممکن نہیں۔ ہم اُن صرف اُن کی اُردو شاعری پر ہی اکتفا کریں گے۔ راہی ترقی پسند تحریک کے ساتھ اُبھرے اور جدیدیت سے بھی متاثر ہوئے۔ اُن کی شاعری میں کلاسیکی شان، ترقی پسندی کی "حقیقت" اور جدیدیت کی دروں بینی نظر آتی ہے۔ راہی اپنی فکری خصوصیات اور نئے شعری تصورات کے سبب ایک امتیازی مقام حاصل کر چکے ہیں۔
اُن کی غزل میں روایت پسندی بھی ہے اور جدید انداز بھی پایا جاتا ہے۔ وہ غزل کو مخصوص ترقی پسند تصوّرات کے اظہار سے برتتے ہیں۔ انہوں نے اعلیٰ پایہ کی نظمیں بھی لکھی ہیں۔

راہی کا اصلی سرمایہ اُن کی نظمیں ہی ہیں ؎

یاد پھر اُس شعلہ رُو کی آ گئی — آ گئی اور آگ سی بھڑکا گئی
وہ لچک کر رہ گئی قوسِ قزح — یا کوئی نازک کمر بل کھا گئی

⁘

نقیب تو نے نئے دن کا صور پھونک دیا — اندھیرا ٹوٹ چکا سونے والوں کو تو جگاؤ

⁘

نہ بجھ سکے گا کبھی آندھیوں سے اب یہ چراغ — حیات نے نئی منزل کا پا لیا ہے سراغ
فسانہائے غمِ دہر طول کھینچ گئے ! — ہنسی حیات کی چھلکا رہی ہے اپنے حلاغ

⁘

کیا تمدن کی حفاظت کے یہی معنی ہیں — علم و آگاہی کے دروازے مقفّل ہو جائیں
جیب میں سکّوں کی جھنکار نہ ہونے کے سبب — آج اُٹھتے ہوئے انساں کے ارادے سو جائیں

— ⁘ —

# قاضی غلام محمدؐ

ولادت ۱۹۳۶ء میں اسلام آباد (کشمیر) میں ہوئی۔ اُن کے والد قاضی محمد حسین علم و ادب کے شائق تھے۔ وراثتاً قاضی غلام محمد بھی علم و ادب کے مالک ہو گئے۔ علی گڑھ سے ایم اے ریاضی میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ ۵۸ء میں جموں و کشمیر یونیورسٹی میں شعبۂ ریاضیات میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ کئی سال پہلے انہیں ریڈر کے عہدے پر ترقی ملی۔ قاضی صاحب ریاست کے مستند اور قابل ریاضی داں مانے جاتے ہیں۔

شعر و سخن سے ابتدائی عمر ہی سے لگاؤ تھا اپنی ذہانت سے اس میں چار چاند لگا دیئے۔ نئی معنویت کو تلاش کرنا، مزاح اور طنز سے صحیح کام لینا، پیروڈی جیسے مشکل فن کو نبھانا، سنجیدہ تصورات کو مضحکہ خیز مرتبہ پر لانا، سنجیدہ چہرے سے نقاب ہٹا کر خندہ ریزی کے مواقع پیدا کرنا، سماجی مسائل کو اُبھارنا اور زبان و بیان پر مکمل قدرت رکھنا قاضی کی ذہانت کی نمایاں خصوصیتیں ہیں۔ قاضی صاحب غالب کو بے انتہا چاہتے ہیں، اسی لئے وہ غالب کی شاعری میں نئی معنویت تلاش کرتے ہیں۔

آیئے! اُن کی شاعری کو ایک جھروکے سے دیکھیں:۔

میرے ماتم میں نہیں اپنی رقم کے غم میں
شہر کا بنیا سیہ پوش ہوا میرے بعد

اختر شیرانی کی نظم کا بگڑا روپ:۔

کیا اب بھی وہاں کا ہر گنجا اسکالر سمجھا جاتا ہے!
کیا اب بھی وہاں کا ہر اک لے غالب پر کچھ فرماتا ہے!

اقبال سے بھی سے ٹکراتا ہے	اور جہل کی ظلمت میں کھو کر

قطعہ :-

قبائے زریں ملبوس منکر	میسر نعمتیں ہیں اس کو کیا کیا
بدن اپنا ہے ننگا، پیٹ خالی	ہم اس کے ہیں "ہمارا پوچھنا کیا"

⁂

ڈر یہ نہیں کہ ہجر میں جینا محال ہے	ڈر یہ ہے خاکسار کثیر العیال ہے

جاؤں میں غم نصیب کہاں اور کہاں نہیں
وہ کونسی جگہ ہے جہاں "تیری ماں نہیں"

اُن کا مجموعۂ کلام "حرفِ شیریں" کے نام سے سنہ ۱۹۶۲ء میں ڈاکٹر زور نے شائع کیا ہے۔

# فاروق نازکیؔ

آپ میر غلام رسول نازکیؔ کے فرزندِ ارجمند ہیں۔ سری نگر میں ولادت ہوئی اور اسی شہر کے شور و غل میں تعلیم مکمّل کی۔ یہاں کی یونیورسٹی سے اُردو میں ایم اے امتیاز کے ساتھ کامیاب کیا۔ ریڈیو کشمیر میں ملازم ہوئے۔ بعد میں دوردرشن میں پروڈیوسر ہو گئے۔ آج کل دہلی میں تعینات ہیں۔

شعر و ادب کا ذوق اپنے گھر کے ماحول سے پیدا ہوا۔ رفتہ رفتہ اچھے شاعروں میں شمار ہونے لگے۔ بنیادی شوق نے ماحول سے شہ پاکر انہیں کہنہ مشق بنادیا۔ جدید انداز کے شاعروں میں اُن کا ایک منفرد مقام ہے۔ روایتی غزل سے زیادہ نظم کی طرف راغب ہوتے۔ اِن کی نظم کلاسیکی انداز اور جدید آہنگ لئے ہوئے نظر آتی ہے۔ اُن کی فکر کا موضوع عام طور پر حالات کے مسائل ہیں۔ جدید انداز میں نظم کہتے ہیں اور علامتوں کے اظہار پر قدرت رکھتے ہیں۔ "تثلیث" اور "ایک احساس" وغیرہ اُن کی بہت اچھی نظمیں ہیں۔ اُن کی غزلوں میں ہمارے اپنے عہد کے پیدا کردہ اسلوب، موضوعات اور رویے ملتے ہیں۔

ملاحظہ ہوں ان کی شاعری کے کئی رنگ :-

(نئی نظم کا سفر)

گماں کے شہر میں، اوہام کے مکانوں سے
نکل پڑے تھے کئی کارواں یقینوں کے
جمالِ صبح میں تھا قتلِ ماہتاب کا رنگ
فلک کی مانگ میں کچھ داغ تھے جبینوں کے
نظر نظر سے ٹپکتا تھا زہر کا الماس!
دلوں پہ پلتے تھے جب سانپ آستینوں کے
ہمیں نے اپنا مقدر لکھا تھا پانی پر
ہمیں نے آگ لگائی تھی خود سفینوں میں
یہ اُن دنوں کی کہانی ہے جن دنوں ہم تم
چھپائے پھرتے تھے اک دوسرے کو سینوں میں
ازل کو ریت پر لکھی گئی تھیں تقدیریں
فنا کے شہر میں آئے تو جاوداں ٹھہرے
وہ جب بھی اُترے ہیں اونچائیوں سے اُترے ہیں
جو قربِ ذات کی لذت کے رازداں ٹھہرے

(غزل میں کلاسیکی انداز)

| | |
|---|---|
| مہ وشانِ چمن کی بات کرو | زیست کے بانکپن کی بات کرو |
| آج تلخی بہت زیادہ ہے | جامِ توبہ شکن کی بات کرو |
| گلعذاروں سے پیار کرنے دو | نرگس و نسترن کی بات کرو |
| بُت کدوں کے چراغ جاگ اُٹھیں | اُس بتِ سیم تن کی بات کرو |

میں کہ ہوں امن کے گُلشن کا شفق رنگ گلاب
میرے ہونٹوں پہ ہے شبنم کی ملائم تحریر
میرے اوراق پہ مرقوم ہے اُلفت کی کتھا
قصۂ ذوقِ نظر
قصۂ نغمۂ وصل
اور ملاقات کی شاموں کے سُہانے قصّے
آتشِ لالہ و گُل مجھ سے جلا پاتی ہے
چشمِ نرگس کو دیا میرے ہی جلووں نے خمار
میں ہوں پیغمبرِ گُل اور بہاروں کا رسُول!

— :. —

# محمد امین کامل

آپ سنہ ۱۹۲۴ء میں کشمیر کے ایک قصبہ پرن میں پیدا ہوئے تعلیم بی۔ اے ایل ایل۔ بی تک پائی۔ کلچرل اکیڈمی کے ایک بڑے عہدے تک ترقی کر کے ریٹائر ہوئے۔ کامل صاحب ادبی حلقوں میں امین کامل کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ کشمیر کے ممتاز شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ امین کامل کے پہلے استاد طالب تھے۔ اُن ہی کی نگرانی میں اُن کی شاعری پروان چڑھی۔ رفتہ رفتہ ریاضت سخن سے اُستادوں میں شامل ہوئے۔ زمانۂ طالب علمی میں غریق تخلص کرتے تھے، بعد میں کامل تخلص اختیار کیا۔ غزل میں اتنی مہارت حاصل کی کہ باہر کے مشہور رسائل [illegible] غزلیں شائع ہوتی [illegible] تک اپنا کلام جمع کیا کہ ایک شعری

مجموعہ ہو گیا۔ مگر نامساعد حالات کی وجہ سے وہ چھپ نہ سکا۔

عام طور پر شاعروں کی طرح کامل نے بھی اپنی شاعری کی شروعات غزل سے کی۔ لیکن ان کی غزل روایت پسندی سے باہر نہ جا سکی۔ ترقی پسندوں کا ساتھ ہوا تو نظم لکھنے کی طرف مائل ہوئے، نئی فکر اور نئے انداز کو اپنا۔ ان کی نظموں میں جیتے جاگتے انسانوں کے دکھ سکھ کی کہانیاں، حقیقت کے پس منظر کیساتھ نظر آتی ہیں۔ حقائق سے وابستگی اور نئی روش سے وابستہ اُن کی نظموں کا خاص طور پر حاصل کلام ہے۔ وہ زندگی کے تذبذب سے آنکھیں نہیں چراتے۔! حقیقت سے آنکھیں ملانا کامل صاحب کی ایک خاص ادا ہے۔ غرض زندگی کے گوناگوں مسائل کامل صاحب کی تخلیق شعر کے لئے ممتحن و محرک ثابت ہوئے ہیں۔

پُرانی شاعری اور نئی شاعری کے دوراہے پر یوں کامل صاحب تذبذب کے عالم میں کھڑے ہیں ؎

اک کٹھن منزل سی ہے پیش نظر — اور بلا کی کش مکش ہے کیا کروں
ایک جانب ہے نئی طرزِ روش — اِک طرف کہنہ روش ہے کیا کروں

(ان کی نظم "خلش" سے)

یوں تو کامل ترقی پسندوں میں شامل تھے، مگر روایتی غزل سے کبھی ناطہ نہ توڑا۔ ہاں یہ ظاہر ہے کہ غزل میں بالآخر انھیں نئے اثرات کو لانا ہی پڑا۔ نظم میں وہ خالص ترقی پسند لگتے ہیں، جب کہ غزل میں کہیں کہیں کلاسیکیت کے عاشق بھی دکھائی دیتے ہیں۔

نظم میں ترنم اور فکر کی تندہی ملاحظہ ہو ؎

جو آگ لگائیں کھیتوں میں — مُنہ بند کریں برساتوں کا
اِس امن کی پیاسی دھرتی پر — کیا کام ہے ان بدذاتوں کا
کیا اُن کی سہانی جھولوں سے — نورانی نظارے ڈھلتے ہیں

نظم میں اقبال کا آہنگ :-

کروڑوں میں لوحا دتو! اے آندھیو! آؤ ہم چلو
بجلیو! برساؤ آتش، پھٹ پڑو۔ اے زلزلو

رومانی لمحات کے نظارے :-

مہکتی زلفیں ہوا سی، چمکتا ماتھا ہے
کہ روح صبح چمن ہے، روان شام ہے وہ

⁂

تری نظر کا تبسم، تری جبیں کی جھلک
اُمید بن کے نکھرتی ہے میری آہوں میں

— ⁂ —

# میرزا کمال الدین شیدا

آپ کی ولادت سنہ ۱۹۰۰ء میں سرینگر میں ہوئی۔ ان کے والد میرزا جلال الدین میرزا کشمیر کے جید عالم اور اچھے شاعر تھے۔ جن کی کچھ غزلیں اور مثنوی "حسن و گوہر" میں موجود ہیں۔ میرزا کمال الدین کے ادبی ذوق کی نشو ونما میں ان کے والد کا نمایاں ہاتھ نظر آتا ہے۔ میرزا نے سنہ ۱۹۲۹ء میں بی اے پاس کیا۔ حکومت نے انہیں بلدیات میں تربیت کے لئے ہندوستان کے کئی شہروں میں بھیجا۔ جہاں سے وہ تربیت حاصل کر کے سری نگر کے وارڈ آفیسر مقرر ہوئے۔ اور ترقی کر کے ڈائریکٹر لوکل باڈیز ہوگئے۔ سنہ ۵۸ء میں حکومت نے ان کے علمی و ادبی ذوق کے مدِنظر کلچرل اکادمی کا معتمد منتخب کیا۔ اور آج کل اوقاف اسلامیہ میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

شیدا کا تخلیقی شعر بہت پرانا ہے۔ روایتی، ترقی پسند اور کلاسیکی اسالیب

تینوں کو انھوں نے پرکھا اور برتا ہے۔ وہ غزل میں تغزل سے زیادہ اخلاقی پہلو پیش کرتے ہیں۔ نظم میں کہیں کہیں وہ "دروں بینی" پر مائل ہو جاتے ہیں۔ شیدا نے مناظرِ قدرت اور خاص طور پر کشمیر کے مناظر پر حفیظ جالندھری کے انداز میں نظمیں لکھی ہیں۔

ذیل میں ہم اُن کی شاعری کے کئی رنگ پیش کرتے ہیں:۔

ابرِ رحمت اب بھی آفاق گیر
آدمِ خاکی ہوس میں ہے اسیر

شیخ حمزہؒ سے عقیدت کا اظہار:۔

اے ذکی! مجھ کو گلہ ہے یار سے — تجھ کو شکوہ چرخِ ناہنجار ہے
عشق کو صورت گرِ عالم کریں — کیوں جہانِ کاف و نوں برہم کریں

⁘

تیری فطرت سے ناداں فتنہ سامانی نہیں جاتی
نہیں جاتی، نگہہ کی تنگ دامانی نہیں جاتی
سمٹ سکتا نہیں بکھرا ہوا ملّت کا شیرازہ
کہ جب تک نوجوانوں کی تن آسانی نہیں جاتی
بدل کر روپ جمہوری وہی دورِ شہنشاہی
مِری محکوم دُنیا سے جہانبانی نہیں جاتی

⁘

شیدا کا کلام ابھی تک مجموعے کی صورت میں شائع نہیں ہوا ہے۔

— ⁘ —

# مرغوب بانہالی

آپ ۷ستمبر ۱۹۳۷ء میں بانہال کے موضع بنکوٹ میں پیدا ہوئے۔ میٹرک پاس کیا۔
معلم ہوئے۔ فارسی اور اردو میں ایم اے کیا۔ کشمیر یونیورسٹی میں لیکچرار مقرر ہوئے
اور آج کل کشمیر کے شعبۂ "سینٹرل ایشین اسٹڈیز" میں کام کر رہے ہیں۔ مرغوب
اُردو اور کشمیری کے ایک اچھے شاعر ہیں، اُردو غزل پر خاصی قدرت رکھتے ہیں۔
شاعری کے علاوہ مرغوب ایک سلجھے ہوئے تاریخ داں بھی ہیں۔ ان کی ناقدانہ
نظر عمیق اور گہری ہے۔ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ زیرِ نظر مقالے میں اُن کے
تمام اوصاف کو زیرِ بحث لانا ممکن نہیں۔

سرِ دست اُن کے کچھ شعر سنیئے:-

کب تک وفا کے زمزمے گائے کسی کا دل
کب تک جفا کا درد چھپائے کسی کا دل
تابانیٔ خرد سے سکوں ہے گریز پا!
ڈھونڈے ہے پھر جنوں کے سائے کسی کا دل

ایک غزل جو مسلسل لگتی ہے ؎

پھیلا ہوا ہے چار سو جلوہ بہار کا
ہے یہ شفق بھی عکس کسی لالہ زار کا
مشکل ہے کھلنے پائے مرا غنچۂ امید
ہمدم مجھے پیام نہ دے نو بہار کا

— . . —

"کشمیر میں اُردو شاعری کے اس جائزے کے
بعد وادی میں اُردو شاعری کے معیار اور
رفتار کا قارئین کو اندازہ ہوگیا ہوگا — لیکن
دل چاہتا ہے کہ کشمیر کے اُن چند نوجوان شعرا کا
بھی ذکر کیا جائے، جو بڑی تیزی سے اُردو شاعری
میں اپنی حیثیت منوا رہے ہیں۔
ایسے شاعروں میں خالد بشیر، فاروق آفاق
شافی شفائی، رفیق ہمراز، نذیر احمد نظیر،
یوسف سلیم، ہمدم کشمیری، قیوم کشمیری، فرید پربتی،
رفیق راز، رخسانہ جبیں، مسعود سامون، سلطان
الحق شہیدی وغیرہ اردو کے بلند ایوانوں تک
رسائی حاصل کرنے کی جدوجہد میں رواں دواں
ہیں — !"

**سلطان الحق شہیدی** اُن کی ولادت سرینگر میں ۱۹۲۵ء میں ہوئی۔ یہیں پلے بڑھے اور جوان ہوئے۔ ادیب فاضل کامیاب کیا اور مدرس ہو گئے۔ گذشتہ ۲۰ برسوں سے ادبی میدان میں ہیں۔ نظم اور غزل کے شاعر ہیں۔ ان کے اشعار میں کلاسیکی مزاج بھی ملتا ہے، اور جدیدیت کی بو باس بھی۔ وہ غزل سے زیادہ نظم سے پیار کرتے ہیں۔ ان کا کلام ملک کے مقتدر رسائل میں چھپتا ہے۔ فکرِ نو کا اثر اُن کی نظموں میں نمایاں نظر آتا ہے۔

غزل کے چند اشعار :-

کشتیٔ شوق کو موجوں کے حوالے کردو
بحرِ ہستی میں اُمڈ آئے جو طوفان کوئی

حاصلِ عمرِ گراں مایہ سمجھ لو اس کو
بزمِ احباب میں مل جائے جو انسان کوئی

اب بھی انسان ہے، انسان کے ہاتھوں مجبور
گرچہ مغفور نہ کسریٰ ہے نہ خاقان کوئی

⁂

عظمتِ کفر سے ہے قائم دین!
کعبہ کیا گر نہ ہوں یہ بُت خانے

ہائے رندوں کی بدمذاقی سے
ٹوٹتے جا رہے ہیں پیمانے

جس کا مرہم نہیں ہے تو بھی دوست!
گھاؤ ایسے دئے ہیں دُنیا نے

آزاد نظم کا نمونہ :-

بے کراں آسماں
چاند سورج لئے
ظلمتوں سے مسلسل نبرد آزما
تھے، اور یہ زمین کوہِ آتش فشاں سی تھی پھر۔
کُچھ سکوں سا ملا اس کشاکش کو جب
سرد ہونے لگے آتش فشاں
گھاس اُگلنے لگی اور زرخیزیاں
زیست کو اپنی جانب بلانے لگی
چند کیڑے پلے، چند حیواں بڑھے اور تکمیل انساں کی صورت ہوئی۔

# مسعود سامون

مسعود سامون کو میں نے پہلی بار ایگریکلچرل یونیورسٹی میں ڈپٹی رجسٹرار کے روپ میں دیکھا۔ پہلی ہی نظر میں وہ مجھے دوربین اور شہرت سے دور بھاگنے والے اور زود فہم ذہانت کے مالک لگے۔ دلکش خدوخال، کھِلتا ہوا پہاڑی رنگ، قدوقامت سڈول مگر نحیف انداز لئے ہوئے۔ آنکھوں پر سفید کمانی دار عینک، عینک کے پیچھے دو چھوٹی چھوٹی دوررس چمکتی آنکھیں، ذہانت کا زندہ جاوید ثبوت۔ متوازن پیشانی، ستواں ناک۔ چہرے پر بے ترتیب داڑھی، پتلے پتلے ہونٹ، سر پر چھوٹے سیاہ بال۔ لہجہ انکسار و خلوص سے بھرا ہوا۔ شرافت و وضعداری کی تصویر۔ یہ ہے سامون کا پورا حلیہ!

آپ کشمیر کی اِس گلپوش وادی میں ایک دور دراز پہاڑی علاقے گریس میں ۲۸ فروری ۱۹۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کی جائے پیدائش سری نگر سے دو دن کی مسافت پر واقع ہے۔ یہ پہاڑی علاقہ سردیوں میں تمام دنیا سے کٹ جاتا ہے۔ انتہائی دشوار گذار پہاڑی راستوں کی وجہ سے اس سارے علاقے کو کشمیر کا "پس ماندہ" علاقہ کہا جاتا ہے۔ دشوار اور کٹھن راستوں کی وجہ سے یہاں آمدورفت بہت ہی کم ہے۔ اسی وجہ سے یہ علاقہ پچھڑے پن کا شکار ہے۔ یہیں پر ہمارا یہ شاعر پلا اور جنگلی ہرن کی طرح اٹکھیلیاں کرتا ہوا جوان ہوا۔ ان کے والد کا نام محمد انور سامون ہے، وہ ایک بڑے گھر کے چشم و چراغ ہیں، خود بھی ایک بڑی فیملی کو چلا رہے ہیں۔ ہمارے شاعر کے علاوہ وہ سات بیٹوں اور تین بیٹیوں کے فرائض سنبھالے ہوئے ہیں۔ وہ اسکول ماسٹر رہ چکے ہیں، انھوں نے اپنے بچوں کو شروع سے ہی علمی ماحول میں رکھا۔ مسعود صاحب نے گریس میں ہی میٹرک کیا۔

کشمیر یونیورسٹی سے پہلے ایم اے فارسی اور پھر ایم اے اردو کیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے پر ٹیچری کی۔ لیکن ٹیچری راس نہ آئی۔ پھر ایڈمنسٹریٹو سروس میں آئے اور ڈپٹی سکریٹری کے عہدۂ جلیلہ تک پہنچے۔ وہاں سے ڈیپوٹیشن پر اگری کلچرل یونیورسٹی میں آئے۔ آج

کل وہیں پر ڈپٹی رجسٹرار ہیں۔ ایک ملاقات میں، میں نے ان سے پوچھا "آپ کی ادبی زندگی کا آغاز کب ہوا۔؟" "سنہ ۱۹۷۰ء میں۔" انھوں نے جواب دیا۔

س:۔ "آپ شروع میں کن شاعروں سے متاثر رہے۔؟"

ج:۔ "ابتدا میں غالب، میر، اقبال، خیام، حافظ اور بیدل سے متاثر رہا۔ بعد میں تغیرات آئے اور میری پسند بھی تجربے کی کسوٹی پر پرکھ کر بدلتی رہی۔ ویسے میں سب سے زیادہ متاثر اقبال سے ہوا۔ مگر تجربے کی بالغانہ نظر نے مجھے غالب کا گرویدہ بنایا۔"

س:۔ "جس وقت آپ نے شاعری شروع کی۔ اس وقت کشمیر میں اور کشمیر سے باہر اردو شاعری کا کیا حال تھا۔؟"

ج:۔ آج سے بہتر تھا۔ Regional زبانوں کے عروج سے اب اردو کی چمک ماند پڑ گئی ہے۔ پھر بھی قابلِ تردد نہیں ہے۔!"

س:۔ "آپ کے خیال میں کشمیر میں اردو شاعری کب شروع ہوئی۔؟"

ج:۔ "میرے خیال میں کشمیر میں اردو شاعری باضابطہ طور پر آزادی کے بعد ہی شروع ہوئی۔ اس سے پہلے یہ نہ ہونے برابر تھی[1] سنہ ۴۷ء سے اردو شاعری کے عالم میں ایک انقلاب آیا۔ اور اس انقلاب کے اثرات کشمیر پر بھی پڑے۔ جس کی وجہ سے یہاں بھی اردو شاعری زور و شور سے شروع ہوئی۔ کس نے اس کی ابتدا کی، یہ کہنا بڑا مشکل ہے۔"

س:۔ "اردو شاعری کے اہم رجحانات اور خاص طور پر ترقی پسندی اور جدیدیت کے رجحان کا آپ کی شاعری پر کیا اثر پڑا۔؟"

ج:۔ ترقی پسندی سے میں ہرگز ہرگز متاثر نہیں ہوا ہوں، اگر سچ کہا جائے تو میں جدیدیت کی پیداوار ہوں۔ ہاں ترقی پسندوں میں ایک آدمی ایسا ہے، جس سے میں کسی حد تک متاثر ہوا ہوں۔ اور وہ ہے فیض احمد فیض۔ صرف جہاں تک اُن کی کلاسیکی

---

[1] ۔ یہ مسعود سامون کا صرف ذاتی خیال ہے۔

شاعری کا تعلق ہے، ورنہ اُن کی پروپیگنڈا شاعری میرے نزدیک
شاعری ہی نہیں"۔
یہ تھے اُس ذہین شاعر کے خیالات جس نے پچھلی دُو دہائیوں میں اپنی شاعرانہ
عظمت کا ادبی حلقوں میں لوہا منوالیا ہے۔ ان کی شاعری شروع سے آخر تک،
جدیدیت کی پیداوار بھی ہے اور علمبردار بھی۔ شاعری کے رموز و اسرار، نکات و
عروض سے وہ نہ صرف واقف ہیں، بلکہ اُن کو احسن طریقے سے برتنے کا ہنر بھی جانتے
ہیں۔ وہ علامات و ابہام اور ابہام کو نہ صرف اپنی شاعری میں بڑی خوبی سے آزما
رہے ہیں، بلکہ نئے نئے موضوعات کو لے کر اچھوتے پیکروں میں پیش کرنے میں بھی
انتہائی چابکدستی سے کام لے رہے ہیں۔ نظم سے زیادہ غزل میں پختہ ہیں۔ اُن کی
غزل ہر لحاظ سے پایاب ہے۔ مسعود صاحب نظم اور غزل کے ساتھ ساتھ رباعی
بھی کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو اُن کی ایک رُباعی :-

لکھ، لوحِ جبیں میری پشیماں لکھ دے
ہاں صفحۂ ادراک پریشاں لکھ دے
ہر بات بِنا پوچھے ہی لکھنے والے
نا دیدہ قلم دیدۂ گریاں لکھ دے

غزل کے چند اشعار :-

سخت مشکل مرحلوں کے درمیاں
یاد، یارِ مہرباں آئی بہت
پھر حدیں کیسی، کنارے کونسے
پاٹ کم چوڑا تھا طغیانی بہت
بادلوں کی دوستی میں اس برس
سوکھی آنکھوں کو مِلا پانی بہت

ایک اور غزل کے اشعار

فرسودہ زینے گھر کے اُترنا ہے رات بھر
پیاسا ہی اس جزیرے میں مرنا ہے رات بھر
دن بھر ادا ورکس کے سمیٹے رہے مجھے!
پانی کے دائروں میں بکھرنا ہے رات بھر
انصاف ہو چکا ہے جبیں پر مری رقم
کچھ سانس گننے پھر بھی ٹھہرنا ہے رات بھر
وہ سو یا سنگ سنگ ارادوں کو اوڑھ کر
اور مجھ کو آنکھ آنکھ بکھرنا ہے رات بھر

— ⁘ —

# عبد القیوم خاں ہمدم کاشمیری

آپ سری نگر کے ایک متوسط خاندان میں ۱۹۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم پاکر سرکاری آرٹس ایمپوریم میں ملازم ہو گئے۔ انھوں نے جوانمری سے ہی لکھنا شروع کیا۔ عمل پیہم اور یقیں محکم سے اُن کا کلام نکھرتا گیا اور آج اُن کی غزلیں اور نظمیں ملک کے معتبر رسالوں میں شائع ہوتی ہیں۔ وہ روایت پسند بھی ہیں اور نئے اسالیب کو اپنے کلام میں سمونے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ اُن کا کلام "تعمیر" اور "شیرازہ" (سری نگر)، "صبا" (حیدر آباد)، اور "نگارش" (امرتسر) میں اکثر شائع ہوتا رہتا ہے۔

اُن کی شاعری کے چند نمونے :-

چاندنی راتیں ہوں یا برسات کے دن ہمنشیں
دل بہلتا ہی نہیں، لاکھوں جتن ہم نے کئے
میں نے اکثر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
زندگانی کو ہزاروں جاوداں لمحے دیئے

⁂

یہ فقط سوزِ تمنّا کا صلہ ہے اے دوست!
تیرگی میں بھی ہے روشن مرا کاشانۂ دل
لاکھ سمجھاتی رہی عقل، مگر اے ہمدم
آہ! اپنا نہ ہوا یہ کبھی بیگانۂ دل

# رفیق راز

آپ سرینگر کے ایک محلہ براری پورہ میں پیدا ہوئے۔ پہلے فارسی میں شعر کہتے اور نثر لکھتے تھے، پھر اردو کی طرف راغب ہوئے۔ رازؔ صاحب جدید غزل گو ہیں۔ اُردو میں اُن کا کلام اکثر چھپتا رہتا ہے۔ اردو میں ہی انھوں نے سنہ ۱۹۷۶ء میں ایم۔ اے کیا۔ سنہ ۱۹۷۷ء میں انھوں نے نئی دہلی کے قومی مشاعرے میں بحیثیت کشمیری شاعر، کشمیری زبان کی نمائندگی کی۔ رازؔ صاحب پہلے کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ کشمیری میں لیکچرار رہے، پھر ریڈیو کشمیر میں معاون پروڈیوسر مقرر ہوئے اور آج کل اپنی ملازمت کے ساتھ ساتھ ہیں پر اردو اور کشمیری شاعری کی زلفیں سنوارنے میں مصروف ہیں۔

رازؔ کی شاعری تجربوں کا پیکر ہے، انھوں نے ہمیشہ زندگی اور فن کے سفر میں وجود کے تجربے کو رہنما بنایا ہے۔ اس تجربے سے جو کچھ پایا ہے۔ اس کو بے کم و کاست بیان کر دیا ہے۔ اس لئے اُن کی شاعری پر حسّی فضا چھائی ہوئی ہے اور ہر شعر پر ایک بے قرار روح کا غلبہ ہے:-

ایک غزل کے چند اشعار ؎

نہ چاند تارے لکھے تھے نہ آفتاب لکھا تھا
سیاہ شہر کے ماتھے پر زیرِ آب لکھا تھا

وہ پیڑ اب بھی ہے وہیں کہ جسکی چھاؤں میں اکثر
تیرے بدن پر مرے لمس نے شباب لکھا تھا

خزاں رسیدہ پر اک صفحۂ قرار پہ اک دن!
سنہری یاد کے جھونکوں نے سبز خواب لکھا تھا

# رُخسانہ جبیں

آپ نے ۱۹۵۵ء میں خواجہ بازار (سرینگر) میں ولادت پائی۔ والد کا نام غلام نبی شاہ ہے اور وہ سرکاری ملازم ہیں۔ شاعری کی شروعات ۱۹۷۰ء میں کشمیر یونیورسٹی سے کی۔ ابتدا میں مخمور سعیدی، شہریار اور بلراج کومل سے متاثر رہیں۔ پھر تجربے نے انھیں جدید شاعروں کا گرویدہ بنا دیا۔ ۱۹۷۰ء سے ہی اُن کا کلام "شیرازہ" اور "تعمیر" (سرینگر)، "دھنک" (جموں)، "العطش" (جموں) "شب خون، عصری آگہی، جواز، تناظر، واردات، پیشرفت، مفاہیم، سطور اور ہندی "شیرازہ" میں چھپتا رہا ہے۔ ریڈیو کشمیر میں بحیثیت PEX کام کر رہی ہیں۔ جدید غزل گو میں غزل کے فن اور اس کے اصلاحی لوازم کو انھوں نے بڑی محنت سے حاصل کیا ہے، اس لئے ان کی غزل میں فنی جھول نہیں پائے جاتے۔ ان کی غزل میں رمزیت بھی ہے اور قافیوں کی نیرنگی بھی۔ موضوعات اور اسلوب دونوں میں روایت پسندی بہت کم ہے۔ نمونہ کلام دیکھئے ؎

ذرا یہ سوچ کہ کیسا عجیب رشتہ ہے
تمہارا خواب دھواں ہے میرا خیال ہوا

سناں بدست تھا ہر شخص میرے چاروں طرف
بس اپنے سائے میں جائے اماں دکھائی دی

∴

چُرا کے آنکھوں کی بینائی آفتاب دیا
یہ اُس نے اپنی طرف سے بڑی نوازش کی

∴

وہ کور چشم، جسے قتل گاہ کہتے ہیں
مجھے پناہ گہہِ جسم و جاں دکھائی دی

جبینِ گل پہ وہ تصویر اُبھر نہیں پائی
تو لوحِ سنگ پہ اک منظرِ فنا ہی لکھ

∴

کروں گی میں ہی چراغاں ترے جزیرے کو
مرے صدف کے مقدر میں تو سیاہی لکھ

# فرید پربتی

نوجوان شاعروں میں فرید پربتی بچپن سے شعر و شاعری کے دلدادہ رہے ہیں۔ سری نگر تاریخی محلے سنگین دروازہ میں اُن کی ولادت ۸ اگست سنہ ۱۹۷ء میں ہوئی۔ حال ہی میں انہوں نے کامرس میں ایم اے کیا اور ملازمت میں غمِ روزگار کو دفن کر دیا۔ غزل گو ہیں، غزل کے علاوہ رُباعی بھی کہتے ہیں۔ ان کا کلام "نوائے صبح" (روزنامہ۔ سری نگر) اور ملک کے بہت سے جرائد و رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ فرید پربتی کا مزاج اگرچہ کلاسیکیت آمیز ہے۔ لیکن بعض اوقات جدید اسلوب کی پرچھائیاں اُن کے کلام میں حسّی گہرائی بھی پیدا کر دیتی ہے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ کیجئے:۔

وہ رہ گزارِ تمنا سے چوٹ کھا کے گیا
سکوتِ دشت میں اِک شور و غل مچا کے گیا

اُداسیوں کے پرندے منڈیر پر رکھ کر
خموشیوں کے شجر صحن میں سجا کے گیا

زمیں پہ چاند ستارے بکھیرنے والا
نجانے کیوں مرے گھر کا دِیا بجھا کے گیا

گزر کے ابر کی صورت میں بستیوں سے فرید
ہر اک نظر میں عجب تشنگی بسا کے گیا

⁘

بارشِ سنگ وادیوں پہ ہوئی
فعل پر قہر ناگہانی ہے

⁘

سرحد سے بھاگ آیا، سامانِ حرب چھوڑا
ہارا ہوا سپاہی سنیاس لے گیا ہے

⁘

کہاں سے ٹوٹ گیا ہوں مجھے یہ فکر نہیں
میں سوچتا ہوں کہاں سے گرا گئی ہے ہوا

— ⁘ —

# کشمیر کے غیر کشمیری شعراء

عرصۂ دراز سے کشمیر تہذیبی و ثقافتی اعتبار سے ہند و پاک کے دوسرے مراکز سے وابستہ رہا ہے۔ نہ صرف یہ کہ کشمیر کے شاعر و ادیب دلّی، لکھنؤ، کراچی و لاہور اور دوسرے شہروں میں جا کر اپنے تخلیقی جوہر کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں اور اردو شعر و ادب کے سرمائے کو باعثِ افتخار بناتے رہے ہیں، بلکہ موقع بہ موقع اردو کے دوسرے مراکز سے تعلق رکھنے والے شاعروں اور ادیبوں نے بھی کسی نہ کسی عنوان سے وادی میں آکر شعر و ادب کی زُلفیں سنوارنے کی کوششیں کی ہیں۔ ان میں سے بعض شاعر و ادیب ایسے ہیں جو کشمیر آئے اور پھر کشمیر کے ہی ہو کر رہ گئے اور کچھ ایسے ہیں جنہوں نے کشمیر میں ایک طویل عرصہ اس طرح گذار کہ وہ کشمیر کے تہذیبی و ثقافتی ماحول کا ایک لازمی جزو بن گئے۔ چنانچہ کشمیر میں اردو شاعری کے تعلق سے، ایسے غیر کشمیری شاعروں کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، جنہوں نے کشمیر کو اپنا وطن بنا لیا۔ یا پھر اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ یہاں گزارا۔ ایسے لوگوں میں وامق جونپوری، آلِ احمد سرور، مظہر امام، جگن ناتھ آزاد، شمیم رضوی، کمال احمد صدیقی اور عبید صدیقی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

# جگن ناتھ آزاد

کشمیر کے مہمان شاعروں میں جگن ناتھ آزاد ایک ممتاز اور اعلیٰ درجہ رکھتے ہیں۔ وہ یہاں تقریباً ۵ سال سے بھی زیادہ مقیم رہے۔ آپ اُردو کے نامور ترین شاعر تلوک چند محروم کے فرزندِ ارجمند ہیں۔ آپ پیدائشی شاعر اور بسیار گو ہیں۔ اقبال پر اُن کا کام بہت ہی انمول اور گرانقدر مانا جاتا ہے۔ کشمیر میں شعری محفلوں کے روحِ رواں رہے ہیں۔ نئے عہد کے مقبول ترین شاعر، متنوع فکری صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ملک اور ملک سے باہر کے مقتدر رسائل میں متواتر لکھتے رہتے ہیں۔ اُن کا شعری مجموعہ "ستاروں سے ذرّوں تک" ادبی حلقوں میں ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ اردو شاعری کی ہر صنف پر کامیاب اور پایاب طبع آزمائی کی ہے۔

نمونۂ کلام پیش ہے :-

رفتارِ وقت دیکھ رہا ہوں ترا طلسم
طوفاں سمٹ کے آج فقط رہ گیا ہے جُو

ڈھونڈے سے بھی نہ اُس کا مجھے مل سکا سراغ
تہذیب وہ کہ جو تھی زمانے کی آبرو

میخانۂ حیات کا عالم کہوں تو کیا
رند آج کم طلب ہیں، ساقی تہی کدو[۱]

:.:

کہتے ہیں جس کو وقت فقط تیغ ہی نہیں
ایسی یہ تیغ ہے جو سدا بے نیام ہے

:.:

لہجہ بدل گیا ہے تری گفتگو کا آج
اس واسطے کہ آج مجھے تجھ سے کام ہے

:.:

تکمیلِ فن تلاش نہ کر میرے شعر میں!
فن ہے وہی عظیم کہ جو ناتمام ہے

— :.: —



[۱] از نظم "قرطبہ سے ویلنشیا تک" - بشکریہ "مریخ" پٹنہ

# وامق جونپوری

آپ علی گڑھ کی علمی و ادبی فضا کے پروردہ ہیں۔ کشمیر میں تقریباً ۱۵ سال رہے اور ریجنل انجنیئرنگ میں ڈپٹی رجسٹرار کے عہد پر سنہ ۱۹۶۹ء میں ریٹائر ہوئے۔ شعر و سخن کی عمدہ روایات کو اپنے فن و فکر میں جذب کرنا ان کی خوبی رہا ہے۔ کشمیر میں آپ ادبی محفلوں کے روحِ رواں رہے۔ اور ان کے فکر و فن کا براہِ راست یا بالواسطہ اثر کشمیر کے نوجوان شعراء پر پڑا۔ وامق عمدہ غزل کہتے ہیں۔ لیکن نظم ان کا مخصوص میدان ہے۔ نئے انداز کے مرثیہ بھی کہے ہیں۔ اسی کے ساتھ وامق اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ نمونۂ کلام حاضر ہے:-

میں فن کار ہوں میری انگلیاں ہیں زندگی کی نبض پر
قدم مرا زمین پر تو کائنات پر نظر

میں زندگی کا آئینہ میں زندگی کی جان ہوں
ضمیرِ عقل و ہوش ہوں، جنوں کی آن بان ہوں
کبھی ہیں پھول سے بھی نرم گلشنِ حیات میں!
کبھی تلاطمِ حیات کی میں اک کڑی چٹان ہوں

میں سحر صفت رنگ ہوں، کمالِ آزری ہوں میں
نشیمنِ نگاہ و منتہائے دلبری ہوں میں

اگر الجھ گیا تو زلف یار بن گیا ہوں میں
سنور گیا تو سولہواں سنگھار بن گیا ہوں میں

مری زبان شاعری، مرا قلم مصوّری
طرب مرا نفس، نفس مرا صنم گری

میں فکر کا شباب ہوں، نظر کا شاہکار ہوں
سرسوتی کی لاج ہوں، سروپ ہوں، ستار ہوں

جہاں کہیں عوام کا سوال بن گیا ہوں میں
تو جابروں کی جان کا وبال بن گیا ہوں میں

عوام میری زندگی، دوام میری زندگی
شعور ہے، شراب ہے اور جام میری زندگی

—— ⁘ ——

# کمال احمد صدیقی

آپ سرینگر میں بیس سال سے بھی زیادہ عرصہ تک مقیم رہے۔ آپ یہاں کی ادبی محفلوں کی رونق سمجھے جاتے تھے۔ لکھنؤ میں ولادت پائی۔ لکھنوی انداز ان کے بُشرے سے ظاہر ہے۔ جوالعمری ہی سے شاعری شروع کی، اس لئے ان کی شعری زندگی کافی طویل اور تجربہ کارانہ رہی۔ پہلے ترقی پسند تھے، پھر نئے عہد سے بھی ہم قدم ہوئے۔ اپنی فکر کی انفرادیت کی بدولت سخن سنج حلقوں میں ایک خاص مقام پیدا کر لیا۔ اسلوب، زبان اور اظہار کے انداز ان کے اپنے ہیں۔ جن میں نئے رمز اور نئی علامتوں کی بدولت اُن کی انفرادیت نمود حاصل کر لیتی ہے۔ غزل اور نظم میں رمزی انداز سے حُسنِ گفتار پیدا کرنا کمال صاحب کا خاصہ رہا ہے۔ ایک نظم کا اقتباس:-

میرا میخانہ یہی ہے، مرا معبد ہے یہی
ہرا دا ہے مرے کشمیر اتری دل آویز

یہ برف کا خزانہ ہے کہ برف کا کہسار — ایک نوخیز ترنم سے فضائیں سرشار
جب پگھلتی ہے بنا دیتی ہے پتھر زرخیز — آبشاروں کی روانی ہے مسرت انگیز

یہ ترے لالہ و گل اور بھی ہوں گے لیکن
میری محنت بھی ترے حسن میں ہے رنگ آمیز

غزل کے چند اشعار:-

وہ ملاقات تعارف سے زیادہ تو نہ تھی — ہو گئی عشق کی تشہیر بڑی مشکل ہے
واقعی عشق کا ہونا تو بڑی مشکل ہے — لیکن اس عشق کی تفسیر بڑی مشکل ہے
اب تو ہر چہرہ ترا چہرہ نظر آتا ہے مجھے — ذہن ہے اب تری تصویر بڑی مشکل ہے

—:—

# کتابیات


| نمبر شمار | نام کتاب | مصنف | سن اشاعت |
|---|---|---|---|
| ۱ | کشمیر میں اردو (حصہ اول) | پروفیسر عبدالقادر سروری | ۱۹۸۱ء |
| ۲ | کشمیر میں اردو (حصہ دوم) | " " " | ۱۹۸۲ء |
| ۳ | کشمیر میں اردو (حصہ سوم) | " " " | ۱۹۸۴ء |
| ۴ | احوال نامہ | ترتیب کار:- چمن لال چمن، بشیر اختر | ۱۹۷۹ء |
| ۵ | "تعمیر" سری نگر۔ جموں و کشمیر اردو ادب نمبر جلد ۱۴، شمارہ نمبر ۲۔ اگست ۸۲ء | مدیر:- خالد بشیر | اگست ۱۹۸۳ء |
| ۶ | انتخاب اردو ادب نمبر ۴۷ تا ۱۹۷۱ء (وادی کشمیر) | مرتبہ: نور شاہ | ۱۹۷۳ء |
| ۷ | تاریخ صحافت کشمیر | صوفی غلام محی الدین | |
| ۸ | تاریخ کشمیر (فارسی) | پیر غلام حسن کھویہامی | |
| ۹ | شاعران کشامرہ (فارسی) | مؤلفین "بہارِ گلشن کشمیر" کتب خانہ گوالیار | |
| ۱۰ | رقعات خاتم الکمال | لچھمی رام۔ مخطوطہ محفوظ در محکمۂ تحقیقات سری نگر | |
| ۱۱ | تذکرۃ الشعراء (دوم) | میر درد قائم | |

| | |
|---|---|
| ۱۲- ادب اور سماجیات | ڈاکٹر قدوس جاوید |
| ۱۳- نایافت | ڈاکٹر حامدی کاشمیری |
| ۱۴- لاحروف | " " |
| ۱۵- عروسِ تمنا | " " " |
| ۱۶- قصۂ قدیم و جدید | مخمور سعیدی |
| ۱۷- نئی غزل | بشیر بدر |
| ۱۸- اردو شاعری کا مزاج | ڈاکٹر وزیر آغا |
| ۱۹- لہولمس چنار | حکیم منظور |
| ۲۰- ناتمام | |
| ۲۱- جدید غزل | نشاط شاہد |
| ۲۲- جدید غزل | خلیل الرحمٰن اعظمی |
| ۲۳- معیار | " " |
| ۲۴- جدید اُردو غزل | پروفیسر مغنی تبسم |

• رسائل:

"تعمیر" سری نگر۔ "شیرازہ" سری نگر۔ "مریخ" پٹنہ۔ "شاعر" بمبئی۔
"بیسویں صدی" دہلی۔ "آج کل" دہلی۔ "کشمیر" سری نگر۔

• اخبارات:

"سفینہ" سری نگر۔ "آئینہ" سری نگر۔ "آفتاب" سری نگر وغیرہ